عرض احوال

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

اللہ کے غضب کو دعوت مت دو!

قومی اسمبلی کے منظور کردہ ''تحفظ حقوقِ نسواں'' بل کے بارے میں ملک کے تمام معروف دینی حلقوں کے مستند علماء متفقہ طور پر یہ رائے دے چکے ہیں کہ یہ غیر اسلامی ہے۔ قبل ازیں متحدہ مجلس عمل نے اعلان کیا تھا کہ اگر علماء کی طرف سے پیش کردہ ترامیم کو شامل کیے بغیر تحفظ حقوقِ نسواں بل منظور کیا گیا تو وہ اسمبلیوں سے مستعفی ہونے کا اعلان کر دیں گے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ ایم ایم اے نے حسب وعدہ قومی اسمبلی سے مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ اب انتظار صرف اس بات کا ہے کہ وہ باضابطہ استعفے دے کر قومی اسمبلی کی رکنیت کی تہمت اپنے سروں سے عملاً اتار کر ایفاءِ عہد کا عملی مظاہرہ کریں۔ اللّٰھمّ وفّقھم لھٰذا.

اس سارے فسانے کا سب سے زیادہ قابلِ رنج پہلو ہمارے حکمران طبقے کا طرزِ عمل ہے۔ یہ بل جس انداز سے پاس کیا گیا اور پھر اس پر اظہارِ مسرت کے جو انداز اختیار کیے گئے' اس سب پر مستزاد تھا حکومتی حلقوں کا یہ دعویٰ کہ یہ بل قرآن وسنت کے عین مطابق ہے ـــــ!! بل کی منظوری کے بعد ایوان اسمبلی میں وزیراعظم شوکت عزیز صاحب جس یقین وایقان کے ساتھ اس کے مطابق قرآن وسنت ہونے کی گارنٹی دے رہے تھے' ان کا لب ولہجہ اس بات کا غماز تھا کہ شاید پاکستان کے مفتیٔ اعظم وہی ہیں۔ کچھ یہی انداز صدر پرویز مشرف کا بھی تھا۔ گویا قرآن وسنت پر اصل اتھارٹی یہی مقتدر طبقات ہیں' حالانکہ کون نہیں جانتا کہ علم دین کے میدان میں ان کا شمار اُن جاہلین میں ہوتا ہے جو قرآن وسنت اور علوم دینیہ سے قطعی نابلد ہیں! ایک صریحاً خلافِ شریعت بل کو اس دعوے کے ساتھ پیش کرنا کہ یہ قرآن وسنت کے عین مطابق ہے' اُن کے جرم کو کئی چند بنا دیتا ہے۔ اگر انہوں نے واقعی قرآن کو پڑھا ہوتا تو وہ ہرگز یہ جرأت نہ کرتے۔ الفاظ قرآنی ﴿اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (الاعراف) (کیا تم اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاتے ہو جو تمہیں معلوم نہیں؟) اور ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ﴾ (الصف:۷) (اور بھلا اُس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹے

06\meesaq december06\arz-december.inp 8/20/2014 12:59 PM PAGE 1 (1,1)

بہتان باندھے؟) کے بین السطور خالق کائنات اللہ رب العزت کا جو غیظ وغضب جھلکتا ہوا صاف محسوس کیا جا سکتا ہے‘ اگر اس کا انہیں کچھ اندازہ ہوتا تو شاید یہ جسارت کبھی نہ کرتے ـــــ انہیں سوچنا چاہیے کہ وہ اللہ کی عدالت میں اپنے اس طرزِ عمل پر کیا عذر پیش کر سکیں گے‘ جبکہ ملک کے تمام معروف دینی حلقوں کے علماء نے نصف صفحے کے اشتہار کی صورت میں ’’اللہ کے غضب اور عذاب کو دعوت مت دو‘‘ کے عنوان سے اخبارات میں حکومت سے اپیل شائع کر کے انہیں شریعت الٰہی کے ساتھ کھیل اور مذاق سے باز رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ احکامِ شریعت کی خلاف ورزی یقیناً جرم ہے‘ لیکن اس سے کہیں زیادہ بڑا جرم یہ ہے کہ دین وشریعت کو بازیچۂ اطفال بنا دیا جائے‘ جس کا عملی مظاہرہ ہمارا حکمران طبقہ آج کر رہا ہے۔ ایسے لوگوں کو بسا اوقات دنیا میں بھی عبرت کا نشان بنا دیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں مذکور اصحاب سبت کا واقعہ اس کی ایک نمایاں مثال ہے!

جہاں تک حکومت کے پیش کردہ تحفظ حقوق نسواں بل کے قرآن وسنت سے عدم مطابقت کا معاملہ ہے‘ اس ضمن میں وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کے شریعت اپیلیٹ بنچ کے سابق جج مفتی تقی عثمانی صاحب کا مفصل مضمون حال ہی میں بعض اخبارات میں قسط وار شائع ہوا ہے‘ جس میں انہوں نے اِس بل کا بھرپور تجزیہ کر کے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا حق ادا کر دیا ہے۔ قارئین کی سہولت کے لیے یہ مضمون مکمل صورت میں‘ اِن شاء اللہ‘ ندائے خلافت کے آئندہ شمارے میں شائع کر دیا جائے گا۔ میثاق کے زیر نظر شمارے میں ہمارے سینئر رفیق انجینئر نوید احمد صاحب کا فکر انگیز مضمون ’’تحفظِ حقوقِ نسواں بل میں قرآن وسنت سے انحراف‘‘ شامل اشاعت کیا جا رہا ہے‘ جس میں فاضل مضمون نگار نے اس بل کی قرآن وسنت کے مخالف دفعات کی نشان دہی کی ہے۔

حقیقت دین

ایمان کی حقیقت واہمیت اور اِس کے ثمرات ونتائج

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

ہمارے قومی اخلاق کی واحد اساس

ایمان کا معاملہ ہمارے لیے عملی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے کہ ہم اِس وقت بحیثیت قوم ایک اخلاقی بحران (moral crisis) سے دوچار ہیں اور ہمارے ماحول میں بدی کا تسلط اور غلبہ ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں اخلاق وکردار کا معاملہ دگرگوں ہوتا جا رہا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس اخلاقی بحران کا اصل سبب کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاق کے لیے ہمیشہ کسی نہ کسی نظریاتی بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی ملک کے رہنے والوں کے اندر ایک قوم پرستانہ یا وطن پرستانہ جذبہ پیدا ہو جائے تو یہ جذبہ بھی ایسا ہے کہ جس سے مثبت اخلاق وجود میں آئیں گے اور افرادِ قوم کے اندر یہ استعداد پیدا ہوگی کہ کم ازکم وہ اپنی ذاتی منفعت اور ذاتی مصلحت پر اپنی قوم یا وطن کی منفعت کو ترجیح دیں۔ قوم اور وطن کے لیے ایثار اور قربانی، قوم اور وطن سے محبت، قوم اور وطن کے لیے محنت ایسے جذبات ہیں کہ ان سے بھی ایک قوم پرستانہ اور وطن پرستانہ اخلاق وجود میں آجاتا ہے۔

مغربی اقوام کے بارے میں اکثر و بیشتر آپ نے سنا ہوگا کہ انسانی اخلاقیات کے اعتبار سے وہ ہم سے بہت بہتر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر کم سے کم اپنی قوم یا اپنے وطن کے ساتھ جو محبت ہے وہ ان کی اپنی ذات سے محبت سے بالاتر ہے۔

چنانچہ وہ ذاتی مفاد کو پیچھے رکھیں گے‘ قوم کے مفاد کو سامنے رکھیں گے‘ ذاتی مفاد کو مؤخر کر دیں گے‘ وطن کے مفاد کو مقدم رکھیں گے۔ اپنے ہم قوم شخص کے ساتھ جھوٹ نہیں بولیں گے‘ چاہے وہ بین الاقوامی سطح پر آ کر دوسری قوموں کے ساتھ جھوٹ بھی بولتے ہیں‘ ان کو دھوکہ بھی دیتے ہیں اور دوسری قوموں کے ساتھ کیے گئے وعدوں کی برملا خلاف ورزی بھی کرتے ہیں۔ لیکن بہرحال اپنی قوم اور اپنے وطن کی حد تک ان کے پاس ایک محدود دائرے میں اخلاق موجود ہے۔ ہماری بدقسمتی اِس وقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں وہ بھی موجود نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے جو یہ ملک پاکستان بنایا تھا اس کی بنیاد سوائے دین و مذہب کے کوئی ہے ہی نہیں۔ یہ کسی نیشنلزم کی پیداوار نہیں ہے۔ تحریک پاکستان کا محرک اگر کوئی نیشنلزم ہوتا تو وہ اس کے استحکام کے لیے بنیاد بن سکتا تھا۔

نسلی قوم پرستی (Racial Nationalism) بھی ایک ایسا جذبہ ہے جس نے بعض قوموں کو استحکام بخشا ہے۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ جرمن قوم کے اندر یہ جذبہ کس قدر مضبوط ہے۔ اسی کا یہ مظہر ہے کہ یہ قوم ایک صدی میں دو مرتبہ اس طرح برباد ہوئی کہ اس کی اینٹ سے اینٹ بج گئی‘ لیکن چند ہی سال کے اندر یہ قوم دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اور پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد چند سال کے اندر اندر جرمن قوم یورپ کی تمام اقوام کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر پھر کھڑی ہوگئی۔ تو اس قوم کے اندر تعمیرِ نو (reconstruction) کی اس قدر قوت کا اصل سبب یہی ہے کہ ان کے اندر نسل پرستی کا جذبہ موجود ہے۔ ان کا یہ احساس کہ ہم ایک برتر نسل سے تعلق رکھتے ہیں (We are a superior race)‘ ان کے اندر ایک آگ بھر دیتا ہے اور کام کرنے کے لیے قوت‘ محنت اور مشقت کا مادہ پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح یہودی قوم کا معاملہ ہے۔ اگرچہ تاریخ میں اس پر بڑے بڑے شدید دَور آئے ہیں اور بیسویں صدی میں ہٹلر کے ہاتھوں اس پر جو کچھ بیتا ہے اس کا آپ نے ذکر سنا ہوگا‘ لیکن اس کے باوجود یہ اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس کی وجہ بھی ان کا احساسِ

برتری ہے کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور چنیدہ لوگ ہیں (We are the chosen people of God) تو یہ احساسِ برتری کسی قوم کو ابھارتا ہے اور اس کے افراد کے اندر ایک جذبہ پیدا کرتا ہے۔

اسی طرح وطن کا معاملہ ہے کہ وطن سے بھی اگر شدید محبت اور لگاؤ ہو جائے تو اس طرح ایک جذبہ شدت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً ہندو فلسفے میں دھرتی ماتا کا تصور ہے' بلکہ وطن تو اِن کا دیوتا ہے۔ چنانچہ وہ ''جے ہند'' کا نعرہ لگاتے ہیں۔ دوسری طرف مسلمان کا خمیر جس مٹی سے اٹھا ہے' اس میں نسل پرستی اور وطن پرستی کی مطلقاً نفی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خطبۂ حجۃ الوداع کے موقع پر واضح فرما دیا کہ تمام انسان برابر ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى اَعْجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا اَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى)) (مسند احمد)

''کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں۔ فضیلت کا معیار صرف ایک ہے اور وہ تقویٰ ہے۔''

چنانچہ نسلی امتیاز کی جڑ کٹ گئی۔

خاص طور پر یہ ملک پاکستان جو ہم نے بنایا تو اس میں ہم نے وطنیت کی نفی کی۔ اس لیے کہ مسلم لیگ اور کانگریس کا جھگڑا یہی تھا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ ہندوستان ایک وطن ہے اور اس میں بسنے والے ایک قوم ہیں' خواہ وہ ہندو ہوں' مسلمان ہوں' سکھ ہوں' پارسی ہوں یا عیسائی ہوں۔ لیکن اُس وقت علامہ اقبال نے' جو بلاشبہ مصورِ پاکستان' مفکر پاکستان اور مبشر پاکستان ہیں' اس تصور کی شدت کے ساتھ نفی کی۔ ''بانگ درا'' میں وطنیت کے موضوع پر اُن کی نظم آپ حضرات کی نظر سے گزری ہوگی۔ اس میں انہوں نے کس قدر شدید جذبات کا اظہار کیا ہے:

اِس دَور میں مے اور ہے' جام اور ہے' جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!

چنانچہ اب ہمارے پاس اِن میں سے کوئی چیز بھی موجود نہیں ہے کہ جس کی بنیاد پر کوئی اخلاقی جذبہ ابھرے۔ اس کے لیے ہمارے پاس صرف ایک اساس ہے' اور وہ یہ کہ ''اسلام'' جس کے نام پر ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا' وہی اگر ہماری ہڈیوں میں رچا بسا ہوا ہو' اس کی اساسات ہمارے دلوں کے اندر مستحکم ہوں' وہ دین ہمارے وجود میں سرایت کیے ہوئے ہو تو پھر ہمارے لیے اخلاق بھی ہے' کردار بھی ہے' سیرت بھی ہے۔ اس طرح ہمیں وہ مضبوط سنگ بنیاد (foundation rock) میسر آ جاتا ہے جس پر اعلیٰ اخلاق کی ایک عظیم الشان عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔ اس اعلیٰ اخلاق کی پھر وہ صورت نہیں ہوگی کہ وہ صرف قومی حد تک محدود رہے' بلکہ یہ وہ اخلاق ہوگا جو بین الاقوامی سطح پر بھی صداقت' امانت اور دیانت کا دامن نہیں چھوڑے گا۔

قوم پرستانہ اخلاق کے بارے میں تو میں بتا چکا ہوں کہ وہی لوگ جو اپنی قوم کے ہاں کسی ظلم کو برداشت نہیں کرتے' بین الاقوامی سطح پر ان سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں۔ یہ لوگ اپنے وطن میں تو کسی بلی اور کتے کے اوپر بھی ظلم ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ انگلستان میں انسدادِ بے رحمیٔ حیوانات کی بہت بڑی بڑی سوسائٹیاں بنی ہوئی ہیں اور جانوروں پر ظلم کے خلاف ان کی عدالتوں میں مقدمے چلتے ہیں' لیکن یہ وہی قوم ہے جو پوری پوری قوموں کو بیچ دیتی ہے۔ انگریز نے کشمیر کا پورا علاقہ راجہ گلاب سنگھ کو فروخت کر دیا تھا۔ ع

''قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند!''

تو یہ ہے قوم پرستانہ اخلاق کی اصل حقیقت۔ اسی طرح وطن پرستانہ اخلاق کی بھی حدود ہیں اور اس کا ظہور اپنے وطن کے اندر اندر ہی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وطن سے باہر تو اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ لیکن اگر ہم اسلامی اخلاق کو واقعتاً اپنے اندر جذب کر لیں تو یہ اخلاق

کسی بھی جگہ جا کر نا کام نہیں ہوگا اور اس کی حدود کہیں ختم نہیں ہوں گی۔

جس زمانے میں سلطنت روما کے ساتھ مسلمانوں کی ابتدائی جنگیں ہو رہی تھیں تو حضرت خالد بن ولید ؓ نے پیش قدمی کرتے ہوئے شام کے ایک شہر کو فتح کرنے کے بعد وہاں کے لوگوں سے جزیہ وصول کر لیا۔ اس کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ ہرقل کی فوجیں دونوں طرف سے ان کا گھیراؤ کر رہی ہیں تو وقتی طور پر جنگی حکمت عملی (strategy) کے تقاضے کے تحت انہیں اس شہر کو خالی کرنا پڑا۔ لیکن وہاں سے جانے سے قبل حضرت خالدؓ نے وہاں کے شہریوں کو بلا کر جزیہ کی پوری رقم یہ کہہ کر واپس کر دی کہ ہم نے یہ رقم تمہاری حفاظت کے عوض لی تھی' اس وقت چونکہ ہم اس ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتے لہٰذا اپنی رقم واپس لے لیں۔ اس پر وہاں کے شہری رونے لگے۔ تو یہ اخلاق جو ہے اس کی پھر کوئی حدود نہیں ہیں۔ یہ ہر جگہ پر' ہر میدان میں' ہر امتحان میں پورا اترے گا۔

ہمارے ہاں فزیالوجی میں ایک اصول ہے: ''All or none law'' یعنی ایک ایسی شے جو یا تو پوری ہوگی یا پھر بالکل نہیں ہوگی۔ اکثر چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ چلیے پوری نہیں تو ستر فیصد ہی سہی' ستر فیصد نہیں تو پچاس فیصد ہی سہی' یہ بھی نہیں تو تیس فیصد ہی سہی۔ لیکن بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہوں گی تو پوری ہوں گی اور نہیں ہوں گی تو بالکل ہی نہیں ہوں گی۔ چنانچہ مسلمان کے لیے اور خاص طور پر مسلمانانِ پاکستان کے لیے اخلاق کا مسئلہ یہ بن گیا ہے کہ ہمارا اخلاق اگر ہوگا تو اسلامی ہوگا اور وہ اعلیٰ ترین اخلاق ہوگا' لیکن اگر یہ نہیں ہوگا تو پھر ہمارے پاس سرے سے اخلاق کی کوئی بنیاد نہیں رہتی۔ ہمارے اس اخلاق کی بنیاد نہ نسل پرستی بن سکتی ہے' نہ قوم پرستی اور نہ ہی وطن پرستی۔ ہمیں اگر اخلاق ملے گا تو دین سے ملے گا' اور وہ اگر ہم نے جذب کر لیا تو وہ اخلاق پھر اتنا اعلیٰ وارفع ہوگا' جو کسی حد پر جا کر ختم نہیں ہوگا' کسی سطح پر جا کر نا کام نہیں ہوگا۔ یہ ہے اصل وجہ کہ میں ایمان کے بارے میں کیوں بات کرنا چاہتا ہوں۔ میری گفتگو کو محض کوئی مذہبی انداز میں وعظ (sermon) نہ سمجھئے۔ درحقیقت ایمان

ہمارے اخلاق کے لیے واحد سنگ بنیاد ہے جس کے سوا ہمارے پاس کوئی اور اساس اور بنیاد ہے ہی نہیں۔

ایمان کی حقیقت

اب میں عرض کروں گا کہ ایمان ہے کیا! ایمان کے بارے میں عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں یہ تصور ہے کہ جیسے ہر مذہب میں ایک dogma ہوتا ہے شاید ایمان ہمارے مذہب کا dogma ہے۔ سب سے پہلے تو آپ اس مغالطے کو ذہن سے نکال دیجیے۔ ایمان کا لفظ اپنی ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے اس تصور کی نفی کرتا ہے۔ ''ایمان'' کا لفظ ''امن'' سے بنا ہے۔ چنانچہ ایمان کے لفظی معنی ہیں کسی کو امن دینا' امن عطا کرنا۔ کوئی انسان اگر ذہنی اور فکری اعتبار سے پختہ (mature) ہو تو اسے ایک تشویش لاحق ہوتی ہے۔ اس تشویش کو دُور کرنے والی اور اسے امن دینے والی چیز ایمان ہے۔ وہ تشویش کیا ہے؟ وہ تشویش یہ ہے کہ یہ جو کائنات ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ میں نے اور دوسرے کروڑوں لوگوں نے جس ''گنبد بے در'' میں آنکھ کھولی ہے' یہ درحقیقت ہے کیا؟ آیا یہ کائنات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ چلتی رہے گی یا اس کا کوئی آغاز (beginning) اور کوئی انجام (end) ہے؟ پھر یہ کہ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں چلے جاتے ہیں؟ اس دنیا میں ہماری پیدائش سے پہلے بھی ہمارا کوئی وجود تھا یا نہیں؟ اور یہ کہ موت ہماری زندگی کا نقطۂ اختتام ہے یا موت کے ورے (beyond) بھی ہماری کوئی زندگی اور ہمارا کوئی وجود ہے؟ پھر یہ کہ یہ خیر کیا ہے' شر کیا ہے؟ میں کیسے طے کروں کہ کیا چیز بھلی ہے کیا بری ہے؟ پھر یہ کہ علم کیا ہے اور اس کے ذرائع (sources) کیا ہیں؟ علم کا ایک ذریعہ تو سب جانتے ہیں کہ یہ حواس سے حاصل ہوتا ہے۔ میرے پاس آنکھیں ہیں' میں ان سے دیکھتا ہوں' میرے کان ہیں' میں ان سے سنتا ہوں۔ میری بصارت اور میری سماعت سے مجھے ایک علم حاصل ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ میرے اندر ایک صلاحیت بصیرت (visioning) کی ہے۔ آنکھوں نے دیکھا' کانوں نے سنا' میں نے اس کو جوڑا تو ایک نتیجہ اخذ کر لیا۔ یہاں

تک تو سب کو معلوم ہے۔ لیکن آیا اس کے علاوہ بھی کوئی ذریعۂ علم ہے؟ یہ سارے سوالات ہر ذہنی طور پر بالغ انسان کے ذہن میں پیدا ہونے چاہئیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسانوں کی اکثریت ان چیزوں پر شعوری طور پر غور نہیں کرتی' بلکہ جس معاشرے میں انسان آنکھ کھولتا ہے اس میں جو چیزیں جس انداز سے مانی جا رہی ہوتی ہیں ان کو اسی انداز سے مان کر وہ اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ ہم میں سے اکثر کا حال یہی ہوتا ہے۔

ان سوالات کے کچھ نہ کچھ جواب ہیں جو ہماری فضا میں تیر رہے ہیں۔ یہ ہم نے اپنے والدین سے سنے ہیں' اپنے بزرگوں سے اور بڑوں سے سنے ہیں اور ہم نے انہی کو مان کر انہیں اپنی کشمکش حیات کا نقطۂ آغاز بنا لیا ہے۔ لیکن دنیا میں ہمیشہ کچھ ایسے لوگ بھی رہے ہیں جنہوں نے محض تقلیداً ان جوابات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ جو ان کے معاشرے میں موجود ہوتے تھے' بلکہ انہوں نے اپنے غور و فکر سے ان سوالوں کے جواب معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ایسے لوگوں کو ہم حکماء و فلاسفہ کہتے ہیں۔ یہ لوگ ایسے ہیں کہ جنہیں زندگی میں کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہتی جب تک کہ وہ ان سوالات کا جواب معلوم نہ کر لیں۔

یہ لوگ اس غور و فکر میں رہتے ہیں کہ میں کون ہوں؟ میں کہاں سے آیا ہوں؟ کہاں جا رہا ہوں؟ اگر موت میری زندگی کا خاتمہ ہے تو پھر مجھے سارا عیش اسی زندگی میں کرنا ہے۔ ع بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست! اگر موت کے بعد کوئی اور زندگی نہیں ہے تو یہاں حلال و حرام کی تمیز خواہ مخواہ پاگل پن اور بے وقوفی ہے' لہٰذا جہاں ہاتھ پڑ سکتا ہو وہاں آدمی کیوں نہ ہاتھ ڈالے اور ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے اصول پر کیوں نہ عمل کرے؟ ہر ایک جواب پر ایک رویہ (attitude) اور ایک طرزِ عمل (behaviour) وجود میں آتا ہے۔ اگر موت ہماری زندگی کا اختتام نہیں ہے' اس کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے جس کا اس زندگی سے کوئی تعلق ہے' وہاں کوئی سزا اور جزا کا معاملہ بھی ہے تو پھر آدمی کو محتاط ہونا پڑے گا کہ ہو سکتا ہے مجھے میرے جرائم کی سزا یہاں نہ ملے لیکن وہاں جا کر مل جائے اور میری کسی نیکی کا بدلہ مجھے یہاں نہ ملے لیکن

وہاں مل جائے! چنانچہ اس سے انسان کے رویے اور طرزِ عمل میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ ایک شخص وہ ہے جسے صرف کراچی تک کا سفر کرنا ہے' جبکہ ایک شخص وہ ہے جسے امریکہ جانا ہے' تو کیا ان دونوں کی تیاری ایک جیسی ہوگی؟ ایک شخص کو معلوم ہے کہ مجھے صرف زندگی بتانی ہے' لہٰذا کھاؤ' پیو' عیش کرو! جبکہ ایک وہ ہے جسے معلوم ہے کہ مجھے کہیں اور جانا ہے' کسی اور جگہ میری پیشی اور حاضری ہے' جواب دہی (accountability) ہے۔ وہ ایسی عدالت ہے جہاں کوئی سفارش نہیں چلتی' کسی کا زور نہیں چلتا۔ وہاں کوئی آدمی جھوٹ نہیں بول سکتا' اب آپ بتائیے کیا ان دونوں کا رویہ ایک جیسا ہوگا؟

تلاشِ حقیقت کی چند مثالیں

یہ جو معاملہ ہے کہ کچھ لوگوں نے' جنہیں ہم حکماء اور فلاسفہ کہتے ہیں' ہمیشہ ان جوابات کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے' اس کی ایک اہم مثال گوتم بدھ کی ہے۔ وہ کپل وسطو کا شہزادہ تھا' لیکن ۳۰ برس کی عمر میں اپنی جوان بیوی اور شیر خوار بچے کو محل میں سوتے ہوئے چھوڑ کر وہاں سے نکل گیا۔ آپ دیکھئے کہ زندگی میں جن چیزوں کے ساتھ انسان کو ایک دلچسپی اور ایک تعلق پیدا ہوتا ہے وہ سب موجود ہیں۔ وہ محل میں رہ رہا ہے' ایک ریاست ہے جس کا وہ ولی عہد ہے' باپ کے بعد اسی کو راجہ بننا ہے' اس کی جوان بیوی اور شیر خوار بچہ ہے' لیکن وہ سب کچھ چھوڑ کر رات کے وقت محل سے نکل گیا' اور نمعلوم کہاں کہاں کی خاک چھانتا رہا' کن کن جوگیوں کے پاس رہا اور کن کن کی جوتیاں سیدھی کیں' صرف اس لیے کہ یہ حقیقت معلوم ہونی چاہیے کہ یہ ہے کیا؟ اُس نے کسی کو دیکھا کہ وہ بیچارہ اندھا ہے' ٹھوکریں کھا رہا ہے اور لوگ اس پر ہنس رہے ہیں' کسی والدین کے سامنے ان کا بچہ عالمِ نزع میں دم توڑ رہا ہے اور وہ کچھ نہیں کر سکتے' بس رو رہے ہیں' چلّا رہے ہیں۔ اس کا مشاہدہ تھا کہ دنیا کی زندگی میں دکھ ہی انسان کا مقدر ہے' یہاں ہر انسان دکھ میں مبتلا ہے۔ اس کے فلسفے کا مرکزی مضمون ''سروم دُکھم'' ہے۔ اُس نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ دکھ انسان کا مقدر کیوں ہے اور دکھ

سے انسان کیسے نجات پائے گا؟ وہ جو غالب نے کہا ہے کہ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

چنانچہ گوتم بدھ اس سوال کے جواب کی تلاش میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نکل کھڑا ہوا۔ میں اس سے بحث نہیں کر رہا کہ اسے اس کا جواب ملا یا نہیں ملا' اور ملا تو کیا ملا۔ اور پھر یہ کہ آج جو جواب اس کے پیروکار اس کی طرف منسوب کر رہے ہیں وہ صحیح ہے یا نہیں' یہ علیحدہ بحث ہے۔ میں مثال دے رہا ہوں کہ ایسے لوگ ہمیشہ رہے ہیں کہ جنہوں نے اس حقیقت کو معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی طرح سقراط ایک فلسفی اور حکیم و دانا شخص تھا۔ وہ فلسفے اور غور و فکر کے نتیجے میں بعض نتائج تک پہنچتا ہے' لیکن معاشرہ سمجھتا ہے کہ یہ باغیانہ خیالات ہیں۔ اب اس کے سامنے دو متبادل (alternatives) رکھے جاتے ہیں کہ یا اپنے خیالات کا پرچار چھوڑ دو یا زہر کا پیالہ پی لو۔ سقراط نے زہر کا پیالہ پینا پسند کر لیا۔ اس لیے کہ جن حقائق تک میں پہنچا ہوں اگر ان حقائق کو بیان نہ کروں تو زندہ رہنا بے کار ہے۔

اب تلاشِ حقیقت کی ایک مثال اور دیکھئے۔ حضرت سلمان فارسی ؓ ایران میں پیدا ہوئے۔ وہاں کا مذہب آتش پرستی تھا' آگ کو پوجا جا رہا تھا۔ ان کا باپ خود ایک بہت بڑا مذہبی منصب دار یعنی آتش کدے کا کوئی بہت ذمہ دار شخص تھا۔ سلمان سوچا کرتے کہ یہ کیا تماشا ہے' یہ خود اپنے ہاتھ سے آگ جلاتے ہیں' خود ایندھن ڈالتے ہیں اور پھر اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تو وہاں سے ذہن نے بغاوت کی اور گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور تلاشِ حقیقت میں شام پہنچ گئے جو اُس وقت عیسائیت کا گہوارہ تھا۔ آپ وہاں یکے بعد دیگرے کئی عیسائی راہبوں کے پاس رہے۔ پھر انہیں ایک بہت نیک راہب مل گیا' جس کے پاس انہیں کچھ اطمینان اور سکون حاصل ہوا۔ اُس راہب کا جب موت کا وقت قریب آیا تو اس نے سلمان سے کہا کہ میرا علم بتاتا ہے کہ کھجوروں کی سرزمین میں نبی آخر الزمان (ﷺ) کا ظہور ہونے والا ہے'

اگر تمہارا ارادہ قوی اور سچا ہے تو تم جاؤ اور قسمت آزماؤ۔ چنانچہ انہوں نے ایک قافلے کے ہمراہ عرب کی طرف سفر اختیار کیا۔ راستے میں ڈاکوؤں نے قافلے پر حملہ کر کے اسے لوٹ لیا اور اُن کو گرفتار کر کے غلام بنا کر بیچ دیا۔ انہیں یثرب کے ایک یہودی نے خریدا۔ اس طرح آپ مدینے پہنچ گئے' جبکہ آنحضورﷺ ابھی وہاں نہیں آئے تھے' آپؑ ابھی مکہ مکرمہ میں تھے۔ سلمان کے کانوں میں آواز پڑ گئی کہ مکہ میں ایک صاحب نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن آپ چونکہ غلام تھے' آزادی حاصل نہیں تھی' لہٰذا خود نہیں جا سکے' یہاں تک کہ رسول اللہﷺ خود مدینہ تشریف لے آئے۔ اس راہب نے نبی آخرالزمانؐ کی ایک پہچان یہ بتائی تھی کہ وہ صدقہ قبول نہیں کریں گے' ہدیہ قبول کر لیں گے۔ سلمان نے اپنے آقا کی خوشامد کر کے کچھ کھجوریں لیں اور انہیں ٹوکری میں رکھ کر رسول اللہﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کھجوریں پیش کیں۔ آپؐ نے پوچھا کیا ہے؟ عرض کیا صدقہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ صدقہ میں نہیں لیتا' یہ غریبوں کا حق ہے' تقسیم کر دو۔ کچھ دنوں کے بعد پھر اسی طرح ٹوکری میں کچھ کھجوریں لے جا کر پیش کیں اور عرض کیا کہ یہ ہدیہ ہے۔ آپﷺ نے فرمایا ہاں ہدیہ میں قبول کرتا ہوں۔ اس پر سلمان ایمان لے آئے۔ اب آپ غور کیجیے کہ ایک شخص کے اندر موجود تلاشِ حقیقت کی تڑپ اسے کہاں سے کہاں لے گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اکثر لوگ تو اس سطح کے نہیں ہوتے' لیکن بہرحال دنیا میں ایک اقلیت ہمیشہ ایسے لوگوں کی رہی ہے' اور پھر وہ جو راستہ بنا دیتے ہیں اکثر لوگ اس راستے پر چلتے ہیں۔ چنانچہ گوتم بدھ کو ماننے والے دنیا میں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

فلاسفہ کے غور و فکر اور آسمانی ہدایت میں فرق

اب اگلی بات یہ سمجھئے کہ جب یہ تشویش ذہن میں آئی' اور یہ سوالات پیدا ہو گئے تو ان کو حل کرنے کا ایک طریقہ تو فلسفیوں کا ہے' جبکہ دوسرا طریقہ جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ نبیوں کا طریقہ ہے۔ فلسفی تو اپنے سارے غور و فکر کے بعد بھی یہی کہتا ہے کہ ہم یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتے' البتہ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ بات یوں ہے۔ خواہ

وہ اپنی صدی کا سب سے بڑا فلسفی برٹرینڈ رسل ہو یا علامہ اقبال ہو۔ علامہ اقبال کی ذہانت اور ان کی صلاحیت کا لوہا مشرق و مغرب نے مانا ہے' لیکن انہوں نے Reconstruction کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے یہ حرفِ آخر ہے۔ ممکن ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس سے صحیح تر اور پختہ تر نظریات سامنے آئیں۔ تو فلسفی اس سے آگے کبھی نہیں جا سکتا۔ جو فلسفی دعوے کے ساتھ کہے کہ یہ بات یوں ہے وہ اصل میں جاہل ہے۔ تھوڑے علم کے ساتھ آدمی زیادہ بڑا دعویٰ کر گزرتا ہے۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ بہت بڑی شخصیتوں کی ایک سنہری زنجیر ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ان سوالات کا جواب ملا ہے' لیکن وہ ہماری اپنی عقل اور غور و فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کا ایک اور ذریعہ ہے جس کا نام وحی ہے۔ وہ اسے اپنے فلسفے اور اپنے خیالات و نظریات کے اعتبار سے پیش نہیں کرتے' بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں وحی کے ذریعے سے یہ جواب معلوم ہوا ہے۔ ان شخصیات کو ہم انبیاء و رُسل کہتے ہیں۔ ان میں حضرات نوح' ھود اور صالح علیہم السلام کا زمانہ تو قبل تاریخ کا (pre-historic) ہے۔ ہماری تاریخ کا آغاز آج سے تقریباً چار پانچ ہزار سال پہلے ہوتا ہے۔ اس سے زائد کوئی تاریخی ریکارڈ ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تاریخ کے بالکل آغاز (dawn) پر ہیں۔ آج دنیا میں مسلمان' عیسائی اور یہودی' یہ تینوں حضرت ابراہیمؑ کے ماننے والے ہیں۔ وہاں سے انبیاء و رُسل کی جو زنجیر شروع ہوتی ہے یہ بڑی لمبی ہے' جس کی بے شمار کڑیاں ہیں۔ ان میں نمایاں ترین شخصیات حضرات ابراہیمؑ' موسیٰؑ' عیسیٰؑ اور محمد ﷺ کی ہیں۔ انبیاء و رُسل کے پاس جو ذریعۂ علم (وحی) ہے وہ انسانی سماعت و بصارت اور ذہن و عقل (intellect) سے ماوراء ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ مریم میں حضرت ابراہیمؑ کا بڑا پیارا قول نقل کیا ہے۔ انہوں نے اپنے والد سے فرمایا تھا:

﴿یٰٓاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِکَ فَاتَّبِعْنِیْٓ اَھْدِکَ صِرَاطًا

سَوِیًّا ﴿۴۳﴾

''ابا جان! یقیناً میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا تھا' پس آپ میری پیروی کیجیے' میں آپ کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔''

یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ تو گنگا الٹی بہہ رہی ہے کہ بیٹا باپ سے یہ بات کہہ رہا ہے' حالانکہ تجربہ اور معلومات باپ کی زیادہ ہیں' اُس نے زمانے کو زیادہ دیکھا اور برتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے یہ بال دُھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں' تم میرے بیٹے ہو' تم میرے صُلب سے پیدا ہوئے ہو' آج تم مجھ سے کہہ رہے ہو کہ میں تمہاری پیروی کروں؟ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دلیل دی ہے باپ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ: ﴿اِنِّیۡ قَدۡ جَآءَنِیۡ مِنَ الۡعِلۡمِ مَا لَمۡ یَاۡتِکَ﴾ ''یقیناً میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا''۔ علم کے دوسرے ذرائع جو آپ کے پاس ہیں وہ میرے پاس بھی ہیں' آنکھیں ہیں' کان ہیں' دماغ ہے۔ چلیے میں مان لیتا ہوں کہ ان ذرائع سے حاصل کردہ علم آپ کے پاس زیادہ ہے' تجربہ آپ کا زیادہ ہے' لیکن علم کا ایک اور ذریعہ بھی ہے جو آپ کے پاس ہے ہی نہیں' اس ذریعے سے جو علم مجھے حاصل ہوا ہے وہی اصل علم ہے اور آپ کو اس کی پیروی کرنی پڑے گی۔ تو یہ سوالات جو میں نے پہلے آپ کو گنوائے' ان کے جو جوابات انبیاء نے دیے ہیں' ان کا نام ایمان ہے۔ اس لیے کہ اس سے انسان کو اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے۔

میری اب تک کی گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایمان ایک نظریۂ حیات ہے' ایمان کائنات اور حیات کی حقیقتوں کا نام ہے۔ فلسفے میں اور ایمان میں فرق یہ ہے کہ فلسفے کا ماخذ انسانی عقل اور غور و فکر ہے' جبکہ ایمان کا ماخذ وحی ہے' جبکہ ان کا موضوع ایک ہے' ان کے پیش نظر مسائل ایک ہیں۔

انبیاء و رُسل کے بیان کردہ ایمانی حقائق

اب میں گنوانا چاہتا ہوں کہ انبیاء و رُسل علیہم السلام نے ان سوالات کے کیا جوابات دیے۔ یہ جوابات مشترک ہیں۔ اس لیے کہ ایمان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حضرات

ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، داؤدؑ، ہارونؑ اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے جو ایمانی حقائق بتائے ہیں وہ ایک ہی ہیں۔ فرق اگر کچھ ہوا ہے تو شریعت کے احکام میں واقع ہوا ہے کہ نماز کیسے پڑھی جائے، دن میں کتنی مرتبہ پڑھی جائے۔ روزہ کس طرح رکھا جائے اور کتنے روزے رکھے جائیں۔ بنی اسرائیل کے روزے میں بولنے پر بھی پابندی تھی۔ کھانا پینا اور جو دوسری پابندیاں ہمارے ہاں ہیں وہ سب بھی تھیں اور ان پر مستزاد یہ کہ روزے کے دوران بات بھی نہیں کر سکتے۔ پھر یہ کہ ان کے ہاں سحری کا تصور نہیں تھا، بس رات کو سو گئے تو روزہ شروع ہو گیا جو اگلی شام تک چلے گا۔ سحری کا تصور اسلامی روزے میں ہے، کہ آپ طلوعِ فجر سے پہلے پہلے کھا پی سکتے ہیں، بلکہ اس کی تاکید کی گئی ہے کہ سحری ضرور کیا کرو۔ تو یہ جو عملی تفصیلات ہیں ان میں فرق تو ہے، البتہ باقی جہاں تک ان سوالات کا جواب ہے، جسے ہم ایمان کہتے ہیں، تو اس میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ ایک ہی جواب ہے جو حضرات نوحؑ نے، ھودؑ نے، صالحؑ نے، ابراہیمؑ نے، یعقوبؑ نے، اسحاقؑ نے، اسماعیلؑ نے، موسیٰؑ نے، عیسیٰؑ نے، یہاں تک کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے دیا۔ ان سب کا جواب ایک ہی ہے اور وہ جواب یہ ہے:

(۱) اللہ پر ایمان: یہ کائنات نہ ہمیشہ سے ہے نہ ہمیشہ رہے گی، البتہ ایک ذات ایسی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اُس ذات نے اس کائنات کو پیدا کیا۔ چنانچہ یہ کائنات مخلوق ہے۔ اس کو پیدا کرنے والی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، جس کے بہت سے صفاتی نام ہیں۔ ان کے علاوہ لوگوں نے اسے رام، ایشور، بھگوان اور پرماتما جیسے نام بھی دے رکھے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں تنہا ہے۔ کوئی اُس جیسا، اُس کی مثل، اُس کی مثال، اُس کے مشابہ، اُس کا مدّ مقابل، اُس کا ہمسر اور اُس کا ہم پلہ نہیں۔ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ:۱۱) اس کو ہم کہتے ہیں ''ایمان باللہ''۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کی نہ تو کوئی ابتداء ہے، نہ انتہا ہے۔ یہ کائنات اُس نے پیدا کی ہے۔ وہ خالق ہے اور یہ مخلوق ہے۔ جس اعلیٰ صفت کا آپ تصور کر سکتے ہیں، وہ اس میں بتمام و کمال موجود ہے۔ سننا ایک وصف ہے، وہ سب کچھ سننے والا ہے۔ دیکھنا ایک وصف ہے،

وہ سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ زندگی ایک وصف ہے' وہ زندہ ہے' الحیّ القیوم ہے' علم ایک وصف ہے' وہ ہر شے کا جاننے والا ہے' عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اور بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ہے۔ قدرت اور اختیار ایک وصف ہے' وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے۔ ان کو آپ صفات (attributes) کہتے ہیں۔ انگریزی میں ہم کہتے ہیں کہ وہ Omnipresent (ہر جگہ موجود) ہے' Omnipotent (قادرِ مطلق) ہے' Omnificent (خالقِ کل) ہے' Omniscient (علّام الغیوب) ہے۔ تو یہ پہلا ایمان ہے جس کو ہم کہتے ہیں ایمان باللہ (اللہ پر ایمان)۔

(۲) حیاتِ اُخروی پر ایمان: دوسرا ایمان یہ ہے کہ انسان کی زندگی صرف یہ نہیں ہے جو وہ اس دنیا میں بسر کرتا ہے' بلکہ ایک وقت آئے گا کہ اس پوری دنیا کی بساط اُلٹ دی جائے گی' طبیعی قوانین (physical laws) جو اِس وقت یہاں کارفرما ہیں' ختم ہو جائیں گے' ایک نیا عالم نئے طبیعی قوانین کے ساتھ پیدا ہوگا اور تمام انسان دوبارہ زندہ (resurrect) کیے جائیں گے۔ یہ بعث بعد الموت ہے۔ اُس عالم میں انسانوں سے اس زندگی کے ایک ایک عمل کا حساب لیا جائے گا۔ ان کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک قول جو ان کی زبان سے صادر ہوا' اس کا محاسبہ ہوگا۔ پھر جزا و سزا کے فیصلے ہوں گے' کامیاب لوگ جنت میں داخل کیے جائیں گے' جبکہ ناکام لوگ جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ اور وہ زندگی پھر ابدی زندگی ہوگی' جس کا کوئی اختتام نہ ہوگا۔

زندگی کے بارے میں ایک تصور تو یہ ہے کہ زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔ انسان کی پیدائش سے موت تک اُس کی زندگی ہے۔ کچھ لوگ بچپن میں فوت ہو جاتے ہیں ع ''حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے!'' بعض کو عین جوانی میں موت آ جاتی ہے۔ کوئی شخص زیادہ عمر پائے گا تو اسّی نوے برس کا ہو جائے گا' شاذ ہی کوئی اس سے اوپر جائے گا۔

زندگی کے بارے میں دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ محض انسان کی پیدائش سے موت تک کے عرصے کا نام نہیں ہے' بلکہ انسان کی اصل زندگی تو موت کے بعد شروع ہوتی

ہے۔ بانگِ درا میں ''زندگی'' کے عنوان سے علامہ اقبال کی نظم کا ایک شعر ہے:۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی!

اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے اور وہ اصل زندگی ہے۔ قرآن کہتا ہے: ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ (العنکبوت) ''اور یقیناً پچھلا گھر جو ہے سو وہی ہے زندگانی، اگر ان کو سمجھ ہوتی''۔ چنانچہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے ۔ اس کے مقابلے میں یہ زندگی تو کچھ بھی نہ ہوئی۔ محدود (finite) کی لامحدود (infinite) سے کوئی نسبت (ratio) ہے ہی نہیں۔ ہماری یہ زندگی محدود ہے اور آخرت کی زندگی لامحدود ہے۔ ویسے میں سمجھانے کے لیے کہا کرتا ہوں کہ کتاب کے آغاز میں اُس کا دیباچہ ہوتا ہے، لیکن اصل کتاب تو دیباچے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ تو یہ زندگی صرف ایک دیباچہ ہے۔ اصل کتابِ زندگی کا آغاز تو موت کے بعد ہوگا۔ اور اس زندگی کی حیثیت صرف ایک امتحانی وقفے کی ہے۔ یہ امتحانی وقفہ تین گھنٹے کا بھی ہوتا ہے، یہی امتحانی وقفہ تیس برس یا ساٹھ برس کا بھی ہوسکتا ہے۔ فرق صرف کمیت (quantity) کا ہے، نوعیت کا نہیں ہے۔ وہ بھی امتحان ہے، یہ بھی امتحان ہے۔ بانگ درا کی نظم ''زندگی'' کا ایک شعر آپ نے ملاحظہ کیا۔ اس نظم کا آخری شعر یہ ہے:۔

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

یہاں اقبال زندگی کو ایک سمندر سے تشبیہہ دے رہے ہیں جس کی سطح پر انسان ایک بلبلے کی مانند نمودار ہوتا ہے اور اس کا مختصر سا عرصۂ حیات اُس کے لیے امتحانی وقفے کی حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی واقعتاً ایک چیلنج ہے۔ قرآن کا فلسفہ یہ ہے کہ دُنیوی زندگی انسان کے لیے امتحان اور آزمائش کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس امتحان کا نتیجہ قیامت کے روز نکلے گا، جسے قرآن ''یوم الدّین'' (The day of Judgement) بھی

کہتا ہے اور ''یوم التغابن'' بھی۔ یعنی وہ ہار اور جیت کے فیصلے کا دن ہے۔ اُس روز فیصلہ ہو جائے گا کہ کون جیتا کون ہارا' کون کامیاب قرار پایا اور کون ناکام ٹھہرا۔ پھر جزا وسزا کے طور پر جنت ہے یا دوزخ۔ وہ زندگی ابدی زندگی ہوگی۔ ان سب باتوں کو جب آپ جمع کریں گے تو اس کا نام ہے ایمان بالآخرۃ۔

(۳) نبوت ورسالت پر ایمان: ذرا غور کیجیے کہ اس امتحان میں ہمارے پاس کون کون سی چیزیں ہیں کہ جن کی بنیاد پر ہم جواب دہ (accountable) ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ امتحان کچھ پڑھا کر لیا جاتا ہے۔ کسی کا ٹیسٹ لینا ہو تو پہلے اسے کچھ دیا جاتا ہے۔ آپ کسی بچے کو کچھ رقم دیں' پھر آپ دیکھیں کہ یہ اس رقم سے کرتا کیا ہے۔ وہ جھٹ پٹ جاتا ہے اور کھا پی کر اسے برابر کر دیتا ہے یا اس سے کوئی کتاب خریدتا ہے' یا یہ کہ اس کو وہ سنبھال کر رکھتا ہے' اس میں سے تھوڑا سا خرچ کرتا ہے۔ اس کے طرزِ عمل سے آپ کو اس کے رجحانات کا اندازہ ہو جائے گا۔ آپ مٹھی بھر خاک اڑاتے ہیں تو اس سے آپ کو ہوا کا رُخ معلوم ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی جو کچھ انسان کے پاس موجود ہو اس کے بارے میں اس کے طرزِ عمل سے آدمی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو کچھ عطا کیا ہے اس کو وہ ٹیسٹ کر رہا ہے۔ انسان کو سماعت اور بصارت جیسی بنیادی صلاحیتیں (basic faculties) عطا کی گئی ہیں' جن کو ہم بیرونی حواس (external senses) کہتے ہیں۔ پھر انسان کو عقل و ذہانت (intellect) اور استدلال (reasoning) جیسی استعدادات ودیعت ہوئی ہیں۔ ان سب پر مستزاد فطری طور پر ایک اخلاقی قانون انسان کے اپنے اندر موجود ہے۔ کانٹ ایک بہت بڑا فلسفی ہے جو موجودہ ویسٹرن فلاسفی کا باوا آدم ہے۔ اُس نے یہ لفظ استعمال کیا ہے: ''The moral law within'' چنانچہ انسان اپنی فطرت کی راہنمائی میں یہ معلوم کر سکتا ہے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے۔ قرآن کا بھی یہی کہنا ہے کہ ہم نے انسان کو نیکی اور بدی کا شعور عطا کر کے دنیا میں بھیجا ہے۔ انسان اپنے اندر موجود اخلاقی قانون کی رو سے یہ جانتا ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا

بُرا ہے، وعدہ کر کے اسے پورا کرنا اچھا ہے اور وعدہ خلافی کرنا برا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کسی کو دکھ میں دیکھ کر تڑپ اٹھنا اچھائی ہے اور اس کا احساس نہ کرنا برائی ہے، والدین کے ساتھ حسن سلوک، ان کا ادب اور تعظیم نیکی ہے، جبکہ والدین سے گستاخی سے پیش آنا برائی ہے۔ یہ باتیں ہر شخص جانتا ہے اور اس میں کسی مسلمان، ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی یہاں تک کہ بے خدا، ملحد، دہریے میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک شخص کسی مجبوری سے یا کسی مصلحت اور کسی فائدے کے لیے جھوٹ بول رہا ہوتا ہے، لیکن اس کا ضمیر (conscience) اسے بتا رہا ہوتا ہے کہ تم برا کام کر رہے ہو۔ ایسے موقع پر انسان اعتراف کرتا ہے کہ اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا ہے، اُس کا ضمیر اسے کچوکے لگا رہا ہے۔ تو یہ تیسری چیز ہے کہ جسے اللہ نے انسان کو دے کر بھیجا ہے اور ہر انسان ان استعدادات اور صلاحیتوں کی بنیاد پر جواب دہ ہے۔

لیکن انسان پر اللہ کی مزید رحمت یہ ہوئی ہے کہ اُس نے انسانوں میں سے ہی بعض بہت اعلیٰ سیرت و کردار اور بلند اخلاق کے حامل لوگوں کو چُن کر اُن پر وحی کے ذریعے سے (وحی بذریعۂ فرشتہ) ہدایت بھیجی، اور انہیں مامور کیا کہ وہ لوگوں کے سامنے اس ہدایت کو قولاً بھی پیش کریں اور خود اس کا عملی نمونہ بھی پیش کریں۔ یہ حضرات انبیاء و رُسل کہلاتے ہیں۔ جیسے سائنس میں تھیوریٹیکل تعلیم کے بعد لیبارٹری میں پریکٹیکل بھی کروائے جاتے ہیں۔ آپ نے کتاب میں پڑھا کہ پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مل کر بنا ہے۔ اس کے بعد آپ نے لیبارٹری میں جا کر ہائیڈروجن اور آکسیجن کو ملایا تو پانی بن گیا۔ اب آپ کو کتاب میں پڑھی ہوئی تھیوری کے بارے میں کوئی شک نہیں رہا۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رُسل کو مبعوث فرمایا کہ یہ دونوں کام کر کے انسانوں پر حجت قائم کر دو۔ اب وہ اللہ کے ہاں یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ پروردگار! ہمیں معلوم نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہدایت آسمانی کتابوں کی صورت میں جمع کر دی گئی۔ اس سب کو ماننے کا نام ایمان بالرسالت ہے۔

میں یہ بات اختصار کے ساتھ پھر دہرا رہا ہوں کہ اگرچہ ہر انسان اپنی سماعت و

بصارت، عقل وشعور اور نیکی اور بدی کی پہچان جو اس میں ودیعت شدہ ہے، اس کی بنیاد پر جواب دہ (accountable) اور ذمہ دار (responsible) ہے، لیکن رحمت خداوندی کا تقاضا ہوا کہ اس نے اپنی ہدایت (guidance) فرشتوں کے ذریعے اپنے چنے ہوئے انسانوں کے پاس، جو اخلاق اور سیرت وکردار کی بلندیوں پر فائز تھے، بھیجی اور انہیں مامور کیا کہ اس ہدایت کو قولاً اور عملاً انسانوں کے سامنے پیش کریں اور اسی ہدایت کو پھر کتابوں کی شکل میں ریکارڈ کرلیا۔ اس میں ملائکہ آ گئے، وحی آ گئی، نبوت و رسالت آ گئی، آسمانی کتابیں آ گئیں۔ ان سب کا مجموعہ ہے ایمان بالرسالت۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، نبوت و رسالت کا یہ سارا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہے، اور اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت نبی آخرالزمان حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی اور آپؐ ''رحمۃ للعالمین'' ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہدایت قرآن کریم کی صورت میں اپنے نقطۂ کمال کو پہنچی اور نبوت و رسالت کا ادارہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں اپنے نقطۂ عروج اور نقطۂ تکمیل کو پہنچا۔

اب آپ سوچیے یہ ہے ایمان۔ یہ انہی بنیادی سوالات کا جواب ہے جو حساس اور غور وفکر کرنے والے انسانوں کے ذہنوں میں جنم لیتے ہیں۔ اس کائنات کی حقیقت یہ ہے کہ یہ ازلی یا ابدی (eternal) نہیں ہے، ایک ذات ہے جس نے اسے پیدا کیا، وہ اللہ ہے، وہ یکتا ہے: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴﴾ اس میں تمام صفاتِ کمال موجود ہیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۚ﴾ (بنی اسراءیل: ۱۱۰) ''کہہ دیجیے اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو گے سب اچھے نام اُسی کے ہیں''۔ زندگی محض اس دنیا کی زندگی نہیں ہے، بلکہ سب کو مرنے کے بعد جی اٹھنا ہے اور اپنے ایک ایک قول اور ایک ایک عمل کی جواب دہی کرنا ہے۔

دورِ جدید میں ایمانی حقائق کا انکشاف

پچھلے زمانے میں لوگوں کو یہ سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہوگی کہ یہ سب کیسے ہوسکتا ہے؟ لیکن آج تو کوئی مشکل نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایسے ٹیپ ریکارڈر بھی ہیں جو ایک بٹن کی طرح انسان کے لباس میں فٹ ہو سکتے ہیں۔ ایک شخص کو پتا بھی نہیں چلتا اور اس کی ساری گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہوتی ہے۔ تو آج یہ ماننا زیادہ آسان ہوگیا ہے کہ ایک ایک لفظ جو انسان کی زبان سے نکلتا ہے' محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ (قٓ) ''کوئی لفظ (انسان کی) زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگران نہ ہو''۔ پھر یہ کہ انسان کا ہر ہر عمل محفوظ رکھا جاتا ہے۔ پتا نہیں کون سے مائیکرو کیمرے ہیں کہ جو اللہ نے انسان کے اپنے اندر لگا دیے ہیں اور اس کی ہر حرکت ریکارڈ ہو رہی ہے! اللہ تعالیٰ کا کوئی بہت بڑا کمپیوٹر ہے جس میں ہر انسان کا ریکارڈ محفوظ ہو رہا ہے۔ ذرا سا بٹن دبانے کی دیر ہوگی کہ آپ کی پوری زندگی کی فلم چلنا شروع ہو جائے گی۔ سورۂ بنی اسراءیل میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا﴾ ''اب خود پڑھ لے اپنا اعمال نامہ' آج اپنا حساب چکانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے''۔ تو یہ چیزیں پچھلے زمانے میں لوگوں کو شاید کچھ مشکل نظر آتی ہوں گی اور وہ سوچتے ہوں گے کہ ایک ایک انسان کے ایک ایک عمل کی ریکارڈنگ کیسے ممکن ہے' لیکن آج تو یہ سامنے کی بات معلوم ہوتی ہے۔ آج ایک شخص سمجھتا ہے کہ بند کمرے میں میں اکیلا ہوں اور کوئی یہاں مجھے دیکھنے والا نہیں ہے' لیکن ہوسکتا ہے کہیں نہ کہیں کوئی مائیکرو کیمرہ نصب ہو اور اس کی فلم تیار ہو رہی ہو۔ قرآن حکیم میں سورۂ لقمان میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ کسی انسان کا عمل خواہ رائی کے دانے کے برابر ہو اور وہ کسی چٹان کی کھوہ کے اندر گھس کر کیا گیا ہو یا آسمان کی پہنائیوں میں یا زمین کی گہرائیوں میں کیا گیا ہو' اللہ اسے لے آئے گا۔ ﴿يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ﴾. انسان کا کوئی عمل اللہ کی نگاہ سے مخفی نہیں۔

ایمان کے ثمرات ونتائج

ایک انسان کے دل میں اگر یہ بات یقین بن کر بیٹھ جائے تو اب اس شخص کا رویہ کس قدر محتاط ہوگا! کیا وہ کوئی ایسی حرکت کرسکتا ہے جس کے بارے میں وہ یہ محسوس کرے کہ میں اس کی جواب دہی نہیں کرسکتا اور اس کو حق بجانب ثابت نہیں کرسکتا؟ کیا اس کی زبان سے کوئی ایسا لفظ نکل سکے گا جس کے بارے میں اس کا احساس ہو کہ مجھے اس پر کل شرمندگی اٹھانی پڑے گی؟ اصل میں یہ رویہ ہے جس کو ''تقویٰ'' کہتے ہیں۔ یہ اسلامی کردار ہے۔ تقویٰ درحقیقت کسی خاص وضع قطع کا نام نہیں ہے' بلکہ جب دل کے اندر اِن تین چیزوں کا یقین پیدا ہو جائے تو انسان کے عمل سے جس محتاط طرزِ عمل کا ظہور ہوگا وہ تقویٰ کی روش ہے۔ پھر صورت یہ ہو جائے گی کہ ؎

لو سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا!

ایک ایک قدم انسان پھونک کر رکھے گا کہ کوئی غلط حرکت سرزد نہ ہو جائے' کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھوں کہ کسی کی حق تلفی ہو جائے' کوئی عہد جو میں نے کیا ہے اپنے آپ سے یا اپنے اللہ سے یا انسانوں سے' اس میں اپنے بس پڑتے کوئی کمی نہ آنے دوں۔

عہد کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ﴿اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾ (بنی اسرائیل) ''یقیناً عہد کے بارے میں تمہیں جواب دہی کرنا ہوگی''۔ اب اسی پر آپ غور کیجیے کہ ایک سرکاری ملازم نے جو سروس اختیار کی ہے' یہ ایک معاہدہ ہے جو اُس نے حکومتِ پاکستان سے کیا ہے' ایک شخص ایک دن کی دیہاڑی کے اوپر اگر آپ کے ہاں کام کر رہا ہے تو یہ بھی اس کے اور آپ کے مابین معاہدہ ہے۔ اگر وہ اپنا پسینہ نہیں نکالتا اور دل لگا کر کام نہیں کرتا تو معاہدے کی خلاف ورزی کر رہا ہے' بے ایمانی کر رہا ہے' حرام خوری کر رہا ہے' اور اگر آپ اُس سے کام پورا لے کر اُس کی پوری اُجرت ادا نہیں کرتے تو آپ حرام خوری کر رہے ہیں' اُس کی حق تلفی کر رہے ہیں' جس کی آپ کو جواب دہی کرنا

ہو گی۔ اگر آپ صرف عہد کی مسئولیت کو ذہن میں مستحضر رکھیں تو اس سے زندگی کے تمام معاملات درست ہو جاتے ہیں' پوری streamlining ہو جاتی ہے۔

سیرتِ نبویؐ کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ بعثت سے قبل رسول اللہ ﷺ کی ایک شخص سے کسی کاروباری سودے کی بات ہو رہی تھی۔ اسی دوران اسے کوئی کام یاد آ گیا تو اُس نے کہا کہ ذرا ٹھہریے' میرا انتظار کیجیے' میں ابھی آتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ٹھیک ہے تم ہو آؤ' میں یہیں تمہارا منتظر ہوں۔ وہ شخص چلا گیا اور بالکل بھول گیا کہ اسے واپس اسی جگہ آنا تھا۔ تین دن کے بعد اچانک اسے یاد آیا اور وہ وہاں پہنچا تو آپ ﷺ کو وہیں موجود پایا۔ آنحضور ﷺ نے تین دن' تین رات کا عرصہ وہیں گزارا۔ اُس نے معذرت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تو اپنے وعدے کی وجہ سے بندھا ہوا تھا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نبوت و رسالت کے لیے اپنے جن بندوں کا انتخاب کرتا ہے وہ پہلے سے بلندترین اخلاق و کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ اس واقعہ سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ اہل مکہ نے محمد عربی ﷺ کو الصادق اور الامین یوں ہی تو نہیں مان لیا تھا۔ اس دنیا کا ہمیشہ سے یہ دستور ہے کہ کسی کی برائی فوراً پھیل جاتی ہے' لیکن کسی کی اچھائی کو لوگ آسانی سے تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ آنحضور ﷺ کو اُس معاشرے نے الصادق اور الامین مانا تو اس کی وجہ آپ ﷺ کا عظیم اخلاق و کردار اور طرزِ عمل تھا جو اُن کے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔

ایمان کے بارے میں یہ بنیادی باتیں آپ کے گوش گزار کر دی گئی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص جو ذرا سا بھی عاقل و بالغ ہے' اس کے نتائج خود نکال سکتا ہے۔ ہمارا اسلام موروثی ہے۔ ہم مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہوئے تو یہ چیز ہمیں مل گئی۔ ہم نے اپنے والدین سے کچھ نام سن لیے ہیں۔ اللہ' رسول' محمد ﷺ' قرآن' کتاب' جنت' دوزخ' فرشتہ' جبرئیل' لیکن غور کیجیے کہ آیا دل میں ان پر یقین ہے؟ اقبال کہتا ہے:

یقیں پیدا کر اے ناداں' یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

اور اگر یہ یقین پیدا ہو جائے (یہ بہت بڑا ''اگر'' ہے) تو ہمارے فکر و عمل میں بہت بڑا انقلاب برپا ہو جائے گا۔ پھر زندگی میں ہمارا طرزِ عمل، دوسروں کے ساتھ معاملات میں ہمارا رویہ، اپنے فرائض کی بجا آوری میں ہمارا برتاؤ اور اپنے وعدوں اور معاہدوں کے ایفاء کا معاملہ، یہ سب کچھ امانت، دیانت اور صداقت پر مبنی ہوگا۔ جس طرح علامہ اقبال نے کہا تھا:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، شجاعت کا، عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہ سب چیزیں تو گویا ایمان کے ثمرات اور لازمی نتائج (corollaries) ہیں۔ ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ اس شخصیت کا ہیولا خود اپنے ذہن میں بنا سکتے ہیں جس کے دل میں یہ تین ایمانیات جاگزیں ہو گئے ہوں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے لوگوں میں شامل فرمائے ـــــ آمین!

اَللّٰھُمَّ حَبِّبْ اِلَـیْنَا الْاِیْمَانَ وَزَیِّنْـہُ فِیْ قُلُوْبِنَا وَکَرِّہْ اِلَـیْنَا الْـکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ، وَاجْعَلْنَا مِنَ الرَّاشِدِیْنَ

''اے اللہ! ایمان کو ہمارے لیے محبوب بنا دے اور ہمارے دلوں کو اس سے مزین فرما دے۔ اور کفر، نافرمانی اور گناہ کو ہمارے لیے ناگوار بنا دے، اور ہمیں ہدایت یافتہ لوگوں میں شامل فرما!''

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

تحفظِ حقوقِ نسواں بل میں قرآن وسنت سے انحراف

انجینئر نوید احمد ☆

۱۵ر نومبر ۲۰۰۶ء کو پاکستان کی قومی اسمبلی نے حدود آرڈیننس میں ترامیم کر کے ''تحفظِ حقوقِ نسواں'' کے عنوان سے ایک بل کی منظوری دی۔ اس بل میں شامل کی گئی ترامیم کے حوالے سے یہ بحث کی جارہی ہے کہ آیا وہ قرآن وسنت کے مطابق ہیں یا قرآن وسنت سے متصادم ہیں۔ ایک طرف اربابِ اقتدار دعویٰ کررہے ہیں کہ اِس بل کی ایک بھی شق قرآن و سنت کے منافی نہیں۔ چودھری شجاعت حسین کا یہ بیان شائع ہوا ہے کہ اگر ایک ترمیم بھی خلافِ اسلام ہوئی تو وہ اسمبلی سے مستعفی ہو جائیں گے۔ دوسری طرف علماء کرام اور دینی وعلمی حلقوں کی طرف سے اس بل کی کئی ترمیمات کو قرآن وسنت کے منافی قرار دیا جارہا ہے۔ نتیجتاً دینی حلقوں کی طرف سے اِس بل کے خلاف بھرپور صدائے احتجاج بلند کی جارہی ہے۔ ذیل میں اس بل پر تبصرہ اور بل میں کی گئی ترامیم کا ایک جائزہ پیش خدمت ہے۔

بل پر تبصرہ

☆ حدود قوانین کا تعلق خالصتاً شریعتِ اسلامیہ سے ہے۔ منطقی طور پر قرآن وسنت پر مبنی قوانین پر نظرثانی یا کوئی ترمیم کرنے کی اہلیت علمائے کرام ہی کو حاصل ہے۔ جس سلیکٹ کمیٹی نے تحفظِ حقوقِ نسواں بل مرتب کیا ہے وہ اس کام کی اہل ہی نہیں تھی، کیونکہ اس سلسلہ میں نہ کسی ثقہ اور مستند عالمِ دین سے رہنمائی لی گئی اور نہ ہی بل کے حق میں اُن کی تائید حاصل کی جاسکی۔ مشاورت کے لیے حکومت نے جن جید علمائے کرام کی کمیٹی

☆ ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی کراچی

-e-nisvann

بنائی تھی وہ بھی شکایت کر رہے ہیں کہ بل کی منظوری میں اُن کی سفارشات کو اہمیت نہیں دی گئی' لہٰذا یہ بل قرآن وسنت کے منافی ہے۔ گویا اِس بل کو سرے سے کوئی شرعی جواز حاصل ہی نہیں۔

☆ میڈیا سے بڑے تواتر کے ساتھ پروپیگنڈا کیا گیا کہ ''حدود اللہ پر بحث نہیں' لیکن کیا حدود آرڈیننس اسلامی ہے؟'' حدود آرڈیننس کے بارے میں تأثر دیا گیا کہ وہ کوئی خدائی قانون نہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حدود قوانین پر بحث کرنے والوں نے جو ترمیمی بل پیش کیا ہے' کیا وہ اللہ کی طرف سے براہِ راست نازل شدہ ہے؟

☆ یہ امر قابل توجہ ہے کہ حدِّ زنا آرڈیننس کی کُل دفعات ۲۲ ہیں۔ اِن میں سے گیارہ دفعات (۳'۶'۷'۱۰'۱۱'۱۲'۱۳'۱۴'۱۵'۱۶'۱۹) کو مکمل طور پر منسوخ کر دیا گیا ہے۔ سات دفعات (۲'۴'۵'۸'۹'۱۷'۲۰) میں جزوی حذف و ترمیم کر دی گئی ہے۔ اِن سات دفعات میں ترامیم کی تعداد ۱۸ ہے۔ اِس عمل کے بعد صرف ۴ دفعات ایسی ہیں جو اپنی اصل شکل میں حدود قوانین میں موجود ہیں۔ اِسی طرح حدِّ قذف آرڈیننس کی کُل دفعات ۲۰ ہیں۔ ان میں سے آٹھ دفعات (۴'۱۰'۱۱'۱۲'۱۳'۱۵'۱۶'۱۹) کو مکمل طور پر منسوخ کر دیا گیا ہے۔ چھ دفعات (۲'۶'۸'۹'۱۴'۱۷) میں جزوی حذف و ترمیم کر دی گئی ہے۔ اِن چھ دفعات میں ترامیم کی تعداد ۱۲ ہے۔ اس عمل کے بعد صرف چھ دفعات ایسی ہیں جو اپنی اصل شکل میں حدود قوانین میں موجود ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِس قدر حذف و ترمیم کے بعد موجودہ بل کو ترمیم سے تعبیر کیا جائے یا اسے حدود بل کی منسوخی قرار دیا جائے؟

ترامیم کا جائزہ

۱) بل میں ترمیم ۱۷ کے تحت حدِّ زنا آرڈیننس کی دفعہ ۱۹ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اِس دفعہ کی ذیلی شق ۳ کے ذریعے پاکستان میں زنا بالرضا کے انگریز دَور کے ۸ قوانین معطل کر دیے گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تعزیراتِ پاکستان کے سابقہ قانون (دفعہ ۴۹۷) میں کئی امور خلافِ شریعت تھے:

(i) اس قانون کی رو سے زنا بالرضا کوئی جرم ہی نہیں تھا' بلکہ صرف وہ زنا جرم تھا جس میں شوہر کی اجازت کے بغیر اُس کی بیوی سے بدکاری کا ارتکاب کیا جائے۔ بالفاظِ دیگر

زنا بذاتِ خود کوئی جرم نہیں تھا' بلکہ وہ اس لیے جرم تھا کہ کسی دوسرے کے حق میں مداخلت کی گئی ہے۔

ii) سابقہ قانون کے مطابق اگر اس فعل کا ارتکاب اس عورت کے شوہر کی مرضی یا ملی بھگت سے کیا جاتا یا یہ فعل زنا بالجبر کے زمرے میں نہ آتا' تو یہ کوئی جرم ہی نہیں تھا۔

iii) سابقہ قانون کے مطابق اگر کوئی شخص کسی غیر شادی شدہ عورت' بیوہ یا مطلقہ کے ساتھ اس فعل کا ارتکاب کرتا تو اس کا یہ فعل زنا کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔

iv) سابقہ قانون میں اس جرم کی سزا ۵ سال قید یا جرمانہ یا دونوں تھیں۔ گویا شرعی حد کا نفاذ نہیں تھا۔

v) سابقہ قانون میں یہ جرم قابل راضی نامہ تھا۔ اگر مدعی ملزم کو معاف کر دیتا تو مقدمہ خارج کر دیا جاتا تھا۔

vi) سابقہ قانون میں یہ جرم قابل ضمانت تھا۔ ملزم گرفتار ہوتے ہی ضمانت پر رہا کر دیا جاتا تھا۔

موجودہ بل میں اس سابقہ قانون کو بحال کرنے کے لیے حد زنا آرڈیننس کی دفعہ ۱۹ کو کلی طور پر منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ پھر وہی دورِ جاہلیت لوٹ آئے گا کہ پاکستان میں کنواری' بیوہ یا مطلقہ کا زنا بالرضا کوئی جرم ہی نہیں رہے گا۔ یہ اس بل کی سب سے خطرناک بلکہ شرمناک ترمیم ہے' جو صرف خلافِ اسلام ہی نہیں بلکہ اللہ سے جنگ اور اسلام سے بغاوت کے مترادف ہے۔ کیا پاکستانی پارلیمنٹ کے معزز اراکین اور زعمائے قوم نے ایسے بل کے حق میں اپنے ووٹ استعمال کر کے اللہ کے غضب کو دعوت نہیں دی؟

۲) بل میں ترمیم ۱۲ کے تحت حدِّ زنا آرڈیننس کی دفعہ ۱۳ اور ترمیم ۲۹ کے تحت حدّ قذف آرڈیننس کی دفعہ ۱۹ کو کلی طور پر حذف کر دیا گیا ہے۔ اِن دفعات کا قصور یہ ہے کہ اِن کی رو سے حدود قوانین (حدود اللہ) کو دیگر تمام قوانین پر فوقیت دی گئی ہے۔ دوسری طرف سابقہ تعزیراتِ پاکستان (درحقیقت تعزیراتِ برطانوی ہند) کی دفعات کو دوبارہ زندہ کر دیا گیا ہے۔ ان ترامیم کے ذریعے بڑی ڈھٹائی سے باہم متضاد قانون سازی کی جارہی ہے۔ سابقہ قانون میں کنوارے یا کنوری کے لیے زنا بالرضا کی صورت میں بدکاری کی کوئی سزا نہیں رہے گی' مگر دوسری طرف حدود قوانین میں ان کے لیے سزا موجود ہے۔ حدود قوانین کی سابقہ قانون پر کوئی برتری باقی نہ رہنے سے ان قوانین کی بچی کھچی دفعات کی حیثیت بھی متضاد

اور دوہری قانون سازی کی بنا پر عملاً محض نمائشی رہ جائے گی اور بظاہر پاکستان میں حدود اللہ کا نام تو باقی رہے گا لیکن زنا قانوناً جرم ہی نہیں ہوگا۔ نیز یہ بات بھی خلافِ اسلام ہے کہ ایک طرف انگریز کے بنائے ہوئے ایکٹ نمبر ۴۵ بابت ۱۸۶۰ء کے قوانین یا انسانی قوانین کو تو ترجیح حاصل ہو' لیکن اللہ کے قوانین کو ایک اسلامی مملکت میں کوئی نمایاں جگہ نہ مل سکے' جبکہ سورۃ النساء کی آیت ۶۵ اور سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۶ کی رو سے نبی کریم ﷺ کے فیصلے کو قبول نہ کرنے والوں کا دین وایمان خطرے میں ہے۔

۳) حدِّ زنا آرڈیننس کی دفعہ ۴ میں ہر اُس مباشرت کو زنا قرار دیا گیا تھا جو دو مَرد و عورت جائز نکاح کے بغیر کریں۔ لیکن اس دفعہ میں ترمیم ۱۳ کے تحت جائز نکاح کے لفظ سے 'جائز' کو حذف کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ایک شادی شدہ خاتون اگر اپنے شوہر سے طلاق لیے بغیر یا مطلقہ عورت عدت کی مدت مکمل ہوئے بغیر کسی اور مرد سے نکاح کرتی ہے تو شریعت کی رو سے یہ نکاح ناجائز ہے اور زنا کہلائے گا' لیکن موجودہ بل کے ذریعے اس کو جائز کر دیا گیا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ عائلی قوانین کے تحت اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو وہ طلاق اُس وقت تک مؤثر نہیں ہوتی جب تک اس کا نوٹس یونین کونسل کے چیئرمین کو نہ بھیجا جائے۔ اگرچہ شرعی اعتبار سے طلاق کے بعد عدت گزار کر عورت جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے' لیکن عائلی قوانین کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک یونین کونسل کو طلاق کا نوٹس نہ جائے قانوناً وہ طلاق دینے والے شوہر کی بیوی ہے اور اسے کہیں اور نکاح کی اجازت نہیں ہے۔ اب ایسے بہت سے واقعات ہوئے ہیں کہ شوہر نے طلاق کا نوٹس یونین کونسل میں نہیں بھیجا اور عورت نے اپنے آپ کو مطلقہ سمجھ کر عدت کے بعد دوسری شادی کر لی۔ اب اس ظالم شوہر نے عورت کے خلاف زنا کا دعویٰ کر دیا' کیونکہ عائلی قوانین کی رُو سے وہ ابھی تک اُسی کی بیوی تھی۔ جب اس قسم کے بعض مقدمات آئے تو سپریم کورٹ کے شریعت بنچ نے حدود آرڈیننس کے دوسرے اُمور کے علاوہ اس کی دفعہ ۳ کی بنیاد پر اُن خواتین کو رہائی دلوائی اور یہ کہا کہ آرڈی نینس چونکہ شریعت کے مطابق بنایا گیا ہے اور شریعت میں اس عورت کا دوسرا نکاح جائز ہے اس لیے اُس کے نکاح کے بارے میں عائلی قانون کا اطلاق نہیں ہوگا' کیونکہ حدود کا قانون دوسرے تمام قوانین پر بالا ہے۔

۴) زیرِنظر بل میں زنا سے ملتے جلتے تمام تعزیری جرائم کو حدود آرڈیننس سے نکال کر تعزیراتِ پاکستان میں منتقل کر دیا گیا ہے اور حدِّ زنا آرڈیننس میں صرف زنا بالرضا موجبِ

حد کا جرم باقی رہ گیا ہے۔ لہٰذا اس ترمیم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کسی مرد پر زنا موجبِ حد کا الزام ہو' لیکن شہادتوں کے نتیجہ میں یہ بات ثابت ہو جائے کہ مرد نے عورت پر زبردستی کی تھی' یا زنا ثابت نہ ہو' لیکن عورت کو اغوا کرنا ثابت ہو جائے تو عدالت ملزم کو نہ زنا کی سزا دے سکے گی' نہ اغوا کرنے کی۔ عدالت یہ جانتے بوجھتے اُسے چھوڑ دے گی کہ اس نے عورت کو اغوا کیا تھا اور اس پر زبردستی کی تھی۔ اُس کے بعد یا تو ملزم بالکل چھوٹ جائے گا یا اُس کے لیے از سرِ نو اغوا کی نالش کرنی ہوگی اور عدالتی کارروائی کا چکر نئے سرے سے شروع ہوگا۔

۵) بل میں ترمیم ۱۴ کے تحت زنا بالجبر کے جرم کو آرڈیننس سے خارج کر دیا گیا ہے اور اس پر سے حد کی سزا ختم کر دی گئی ہے' حالانکہ اس بات پر اُمت کا اجماع ہے کہ حدود کے ضمن میں متعین سزائیں زمان و مکان بدلنے سے تبدیل نہیں ہو سکتیں۔ اِسی طرح حدود کے معاملہ میں جرم ثابت ہونے پر کسی حاکم یا قاضی کو سزا معاف کرنے اور کمی یا بیشی کرنے کا اختیار نہیں۔ اِس معاملہ میں سفارش کرنا یا سفارش قبول کرنا بھی حرام ہے۔ توبہ کرنے سے دنیا کی سزا معاف نہیں ہوتی البتہ آخرت میں معافی مل سکتی ہے۔ زنا بالجبر کے جرم میں عدالت کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ سزائے موت اور قید میں سے کسی کا انتخاب کر لے۔ یہ فیصلہ قرآنی احکامات کے خلاف ہے۔

۶) بل کی ترمیم ۱۹ کے تحت حدِّ زنا آرڈیننس کی دفعہ ۲۰ شق ۵ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس شق کے مطابق صوبائی حکومت کو سزا معطل کرنے' اس میں تخفیف کرنے یا تبدیلی کرنے کا جو اختیار دیا گیا ہے اُس کا اطلاق حد کی سزا پر نہیں ہوگا۔ یہ شق اس ارشادِ نبوی ﷺ کی روشنی میں مرتب کی گئی تھی کہ جب کسی شخص کے خلاف ضروری کارروائی کے نتیجے میں حد کا فیصلہ ہو جائے تو اُس کی سزا کو معاف یا کم کرنے کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ اس شق کو حذف کر کے ارشادِ نبوی ﷺ کی سنگین خلاف ورزی کی گئی ہے۔

۷) بل کی ترمیم نمبر ۹ میں طے کیا گیا ہے کہ رپورٹ یعنی شکایت کے مرحلے پر ہی مدعی کے علاوہ چار تحریری حلفیہ گواہیاں بھی جمع کرائی جائیں۔ قانون کے اجراء کا یہ طریقہ نہ صرف خلافِ اسلام بلکہ خلافِ عقل بھی ہے۔ دورِ نبوی ﷺ کے متعدد واقعات میں زنا کی شکایتیں محض ایک شخص کے کہنے پر درج کی گئیں۔ اسلام کی رو سے زنا کرنے والے مرد یا عورت کا اکیلا اعتراف بھی ان پر حد کی سزا قائم کرنے کے لیے کافی ہے۔ پھر اسلام میں زنا پر چار گواہیاں بھی مدعی کو شامل کر کے شمار کی جاتی ہیں' نہ کہ اس کو نکال کر۔ پاکستان میں اس سے

بھی زیادہ سنگین جرائم مثلاً بغاوت یا قتل وغیرہ کے لیے پہلے مرحلہ پر ہی جرم کو مکمل ثابت کرنے کا تقاضا نہیں کیا جاتا' پھر حدود قوانین کے ساتھ ہی یہ امتیاز کیوں برتا جارہا ہے؟ یہ معاملہ خلافِ عقل اس لیے ہے کہ ہر جرم کی گواہیاں اُس مرحلے پر لی جاتی ہیں جب جرم کا فیصلہ کر کے مجرموں کو سزا سنانا یا بری کرنا مقصود ہو' جبکہ FIR (فرسٹ انفارمیشن رپورٹ) میں تمام گواہیاں ضروری نہیں ہوتیں۔ یہ رپورٹ دراصل جرم کے خلاف پولیس کے کام میں معاونت ہے' کیونکہ جرائم کی روک تھام اور اِس حوالے سے تفتیش کرنا پولیس ہی کی ذمہ داری ہے۔ اس کی بجائے رپورٹ کرنے والے کو چار گواہیوں کا پابند کرنے کا مطلب تو یہ ہے کہ اس نے ظلم کے خلاف رپورٹ کر کے بذاتِ خود ایک جرم کا ارتکاب کیا ہے' لہٰذا اسے چاہیے کہ وہ پہلے اپنی صفائی پیش کرے۔ گویا اس ترمیم کے ذریعے مجرموں کی حوصلہ افزائی اور مدعی کو ہراساں کیا جارہا ہے۔

۸) حدود سے متعلق جرائم میں پولیس کو از خود کسی قسم کی کارروائی سے روک دیا گیا ہے۔ اب معاشرے میں خواتین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے والوں' کھلے عام نازیبا حرکات اور فحش کام کرنے والوں کو کھلی چھوٹ مل جائے گی اور عصمت فروشی کے اڈوں کی راہ میں حائل تھوڑی بہت رکاوٹ بھی ختم ہو کر رہ جائے گی۔

۹) حدود قوانین کو پولیس کی رپورٹنگ سے نکال کر سیشن کورٹ کے دائرۂ عمل میں داخل کر دیا گیا ہے۔ اب عملاً ایسے جرائم کی روک تھام اور رپورٹ انتہائی مشکل ہو جائے گی۔ پنجاب بھر کے ۳۴ اضلاع میں صرف ایک ایک سیشن عدالت ہے۔ ان عدالتوں میں اس طرح کے کیسوں کا اندراج عام شہری کے لیے انتہائی مشکل ہوگا۔ بعض اضلاع تو اس قدر وسیع وعریض ہیں کہ ایک رپورٹ درج کرانے کے لیے بعض اوقات پورا دن درکار ہوتا ہے۔ یوں بھی ان عدالتوں کے اوقاتِ کار تھانوں کے برعکس کافی محدود ہوتے ہیں۔

۱۰) بل کی ترمیم نمبر ۲۲ میں طے کیا گیا ہے کہ ''عدالت کا افسر صدارت کنندہ مجرم کو بری کرتے ہوئے اگر مطمئن ہو کہ جرمِ قذف مستوجبِ حد کا ارتکاب ہوا ہے تو وہ قذف کا کوئی ثبوت طلب نہیں کرے گا اور حد قذف کے احکامات صادر کرے گا۔'' ان ترامیم سے پتا چلا کہ چار گواہوں کے بعد بھی زنا کے ملزم کی بریت جج کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے اور دوسری طرف مدعی پر از خود قذف کی سزا لاگو ہو جائے گی اور اس صورت میں مدعی کے خلاف قذف کے کسی ثبوت یا عدالتی کارروائی کی ضرورت نہ ہوگی' محض جج کا ذاتی اطمینان ہی کافی ہوگا۔

ان ترامیم کی رو سے ایک طرف زنا کے ملزمین کو غیر معمولی تحفظ دیا جا رہا ہے اور ان کے خلاف رپورٹ کو مشکل تر بنایا جا رہا ہے اور دوسری طرف رپورٹ کرانے والے پر قذف کی سزا لاگو کر کے اس کو بنیادی حقوق مثلاً ثبوتِ الزام کے لیے مطلوبہ گواہیوں اور عدالتی کارروائی وغیرہ سے بھی محروم کیا جا رہا ہے۔ گویا مجرمین کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے اور مظلومین کو ہراساں کیا جا رہا ہے۔ کیا یہ طرزِ عمل اسلام کی عادلانہ تعلیمات کے مطابق ہے؟ کیا اس سے عورتوں کے حقوق کا تحفظ ہوگا یا اُن پر ظلم بڑھ جائے گا؟

۱۱) بل میں حدود سے متعلق جرائم کو قابلِ ضمانت قرار دیا گیا ہے۔ یہ حدود سے متعلق شریعت کے احکامات کی کھلی خلاف ورزی ہے اور اسی کی وجہ سے معاشرے میں غیرت کے نام پر غیر قانونی قتل کا سلسلہ رواج پاتا ہے۔

مذکورہ بالا ترامیم کا نتیجہ

فرض کیجیے کہ ایک جگہ زنا کا وقوعہ ہوتا ہے۔ اب ایسا شخص کہ جس کی عزیزہ سے زیادتی ہوئی ہے، وہ دادرسی کے لیے شکایت درج کرانے نکلتا ہے تو سب سے پہلے چار گواہوں کو تیار کرنا اس کی ذمہ داری ہے جو تحریری حلفیہ گواہی دے سکیں۔ اس مرحلے پر عدالتوں میں سماعت و دادرسی کی ناگفتہ بہ صورتِ حال اور حدِّ قذف کی لٹکتی تلوار سے ڈر کر کوئی آدمی اس مقصد کے لیے راضی ہی نہیں ہوگا۔ اُنہیں راضی کرنے میں ہی وہ شریف آدمی اپنی عزت کی مزید رسوائی تو کما لے گا جبکہ ابھی زنا کے حقیقی مجرموں کی سزا کا دُور دُور تک کوئی امکان نہیں۔ اب دُور دَراز سے سفر کر کے مدعی اور چار گواہ سیشن عدالت میں جا پہنچتے ہیں تو وہاں چاروں گواہ حلفیہ تحریری بیان جمع کرائیں گے۔ اگر اس کے باوجود عدالت کو وقوعہ پر ہی اطمینان نہ ہوا تو ان گواہوں پر قذف کی سزا از خود لاگو ہو جائے گی، جہاں عدالت میں مزید کسی ثبوت یا ملزم کو اپنے دفاع کی گنجائش بھی نہیں ملے گی۔ بالفرض اگر عدالت اُن کی گواہی سے مطمئن ہو کر مقدمہ داخل سماعت کر لیتی ہے، تب بھی مجرموں کو فکرمندی کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ جرم قابل ضمانت ہے، اور عدالت کو مجرموں کی یاسیت اور محرومی کا بھی پورا پورا احساس ہے۔ ان حالات میں سوچیے کہ اصل مجرم وہ ہے جس نے زنا کا ارتکاب کیا یا وہ جس نے اس کو دیکھنے کا گناہ کیا اور جس کی عزت سر بازار پامال ہوئی؟ زنا بالجبر کے جرم کا شکار تو خود عورت ہوتی ہے، اس کے لیے چار گواہوں کی شرط کے بعد قانون کی مدد لینا کیوں کر ممکن ہوگا؟ یہ بل زنا کی شکار عورت پر صریح ظلم بن گیا ہے نہ کہ تحفظِ خواتین بل۔ زنا بالرضا انگریز

E:\Meesaaq_2006\Ms_2006\meesaq december06\ms24-11 haqooq-e-nisvann bill.inp 8/20/2014 1:16 PM PAGE 4 (1,1)

دَور کے قوانین بحال ہونے کی بنا پر جائز‘ حدود قوانین دیگر تمام قوانین کے تابع اور زنا بالجبر میں بھی عورت کے لیے چار گواہ۔ نتیجہ واضح ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں زنا کے لیے ہر طرح کی کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے۔

۱۲) حدِ زنا آرڈیننس کی دفعہ ۱۰ میں زنا کے علاوہ اقدامِ زنا‘ فحاشی اور مبادیاتِ زنا کی بھی سزائیں مقرر کی گئی تھیں۔ جب جنسی فعل کی مکمل شہادتیں پوری نہ ہوں تو اُس وقت فحاشی کے ارتکاب کے جرم میں تعزیرات دی جاتی تھیں‘ تاکہ معاشرے میں فحاشی پھیلانے والوں کی حوصلہ شکنی ہو۔ موجودہ بل میں ترمیم ۱۷ کے تحت اِن تعزیری سزاؤں کو منسوخ کر دیا گیا ہے‘ تاکہ بے حیائی کے فروغ میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔ زنا موجبِ حد کے لیے جو سخت ترین شرائط ہیں وہ بعض اوقات محض فنی وجوہ سے پوری نہیں ہوتیں۔ ایسی صورت میں جبکہ مضبوط شہادتوں سے فحاشی کا جرم ثابت ہو رہا ہو تو اس پر نہ صرف یہ کہ زنا کا مقدمہ سننے والی عدالت کوئی سزا جاری نہیں کر سکتی‘ بلکہ اس کے خلاف فحاشی کی کوئی نئی شکایت بھی درج نہیں کی جا سکتی۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایسے شخص کے خلاف فحاشی کا مقدمہ دائر کرنے پر کلی پابندی عائد کر دینا فحاشی کو تحفظ دینے کے سوا اور کیا ہے؟

۱۳) سورۃ النساء کی آیت ۱۵ میں زنا کے چار گواہوں کے لیے مسلم ہونے کی شرط لگائی گئی ہے‘ جبکہ موجودہ بل کی ترمیم ۹ کے تحت یہ گواہی غیر مسلم بھی دے سکتے ہیں۔ یہ ترمیم بھی غیر اسلامی ہے۔

۱۴) بل میں ترمیم ۵ کی ذیلی دفعہ پنجم میں ۱۶ برس سے کم عمر کی لڑکی سے ہونے والے زنا کو لازماً زنا بالجبر قرار دیا گیا ہے‘ جس کی وجہ یہ پیش کی گئی ہے کہ اس سے کم عمر لڑکی کی رضامندی کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ ترمیم بھی خلافِ اسلام اور زمینی حقائق سے متصادم ہے۔ اس ترمیم کے ذریعے ۱۶ برس تک کی لڑکی کے زنا کو قانونی تحفظ دیا گیا ہے کہ ایسے زنا کو لازماً زنا بالجبر تصور کر کے لڑکی کو سزا سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ بلوغت کے فوراً بعد ہی کئی لڑکیاں زنا بالرضا کی مرتکب ہوتی ہیں‘ جیسا کہ مغربی طرز کے اسکولوں کے اعداد و شمار میں اس امر کا کافی ثبوت موجود ہے۔ زنا کا تعلق ذہنی بلوغت کے بجائے جسمانی بلوغت اور جنسی فعل انجام دینے کی صلاحیت سے ہے۔ پھر تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۸۳ کے تحت ۱۲ برس تک کے بچے کو ہی فوجداری جرم سے استثناء کی رعایت مل سکتی ہے‘ لیکن اس ترمیم میں یہ رعایت ۱۶ برس تک دی جا رہی ہے۔ زنا کے جرم سے ہی یہ امتیاز کیوں برتا جا رہا ہے؟

۱۵) فوجداری قوانین میں زنا یا اس فعل میں تعاون سے متعلق جرائم میں کوڑوں کی سزا بالکل ختم کر دی گئی ہے۔ شریعتِ اسلامی نے قید سے زیادہ زور جرمانے یا کوڑوں کی سزا پر دیا ہے۔ قید کی سزا ایک انسان کے ساتھ بھی زیادتی ہے' یہ کئی دیگر خرابیوں کی وجہ بھی بنتی ہے اور یہ ملکی وسائل پر بھی ایک بوجھ ہے۔

۱۶) زنا آرڈیننس کی دفعہ ۲۰ میں یہ کہا گیا تھا کہ اگر عدالت کو شہادتوں سے یہ بات ثابت ہو کہ ملزم نے کسی ایسے عمل کا ارتکاب کیا ہے جو حدود آرڈیننس کے علاوہ کسی اور قانون کے تحت جرم ہے' تو اگر وہ جرم عدالت کے دائرۂ اختیار میں ہو تو وہ ملزم کو اُس جرم کی سزا دے سکتی ہے۔ اب زیرِ نظر بل میں ترمیم ۲۸ کے تحت عدالتوں پر یہ پابندی عائد کرنا کہ شہادت کے مطابق مختلف جرائم سامنے آنے پر وہ دوسرے جرائم میں سزا نہیں دے سکتیں' مجرموں کی حوصلہ افزائی ہے۔ اس کے نتیجے میں مقدمات ایک عدالت سے دوسری عدالت منتقل ہوں گے اور عدالتی پیچیدگیاں بھی پیدا ہوں گی۔

۱۷) قذف آرڈیننس کی دفعہ ۱۴ میں قرآن کریم کے بیان کے مطابق لِعان کا طریقہ درج ہے' یعنی اگر کوئی مرد اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور چار گواہ پیش نہ کر سکے تو عورت کے مطالبے پر اُسے لعان کی کارروائی میں قسمیں کھانی ہوں گی اور میاں بیوی کی قسموں کے بعد اُن کے درمیان نکاح فسخ کر دیا جائے گا۔ قذف آرڈی نینس میں کہا گیا ہے کہ اگر شوہر لعان کی کارروائی سے انکار کرے تو اُسے اُس وقت تک حراست میں رکھا جائے گا جب تک وہ لعان پر آمادہ نہ ہو۔ زیرِ نظر بل کی ترمیم ۲۶ میں یہ حصہ حذف کر دیا گیا ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر شوہر لعان پر آمادہ نہ ہو تو عورت بے بسی سے لٹکی رہے گی۔ نہ اپنی بے گناہی لِعان کے ذریعے ثابت کر سکے گی اور نہ نکاح فسخ کرا سکے گی۔ مرد کو یہ چھوٹ دینا کہ وہ عورت کے مطالبے کے باوجود ''لعان'' کی کارروائی میں شرکت سے انکار کر کے عورت کو معلق چھوڑ دے' قرآن کریم کے حکم کے منافی ہے۔

۱۸) قذف آرڈیننس کی دفعہ ۱۴ میں کہا گیا ہے کہ اگر لِعان کی کارروائی کے دوران عورت زنا کا اعتراف کر لے تو اس پر زنا کی سزا جاری ہوگی۔ زیرِ نظر بل میں ترمیم ۲۶ کے تحت یہ حصہ بھی حذف کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ اعتراف کر لینے کے بعد سزائے زنا کے جاری نہ ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں' جبکہ لعان کی کارروائی عورت کے مطالبے پر ہی شروع ہوتی ہے' اور اُسے اعتراف کرنے پر کوئی مجبور نہیں کرتا۔

تحفظِ حقوقِ نسواں بل کے مضر اثرات

۱) یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ قوم کو تقسیم کرنے والے ایشوز پر اتفاقِ رائے پیدا کرنے کے لیے ''ذرا سوچیے'' کی مہم چلائی جارہی ہے۔ ذرا سوچیے! قوم اس بحث سے پہلے اتنی تقسیم نہ تھی جتنی اب ہوگئی ہے۔ حدود قوانین کے نفاذ کے موقع پر اگر مسلمانانِ پاکستان کو ان پر اتفاق تھا جسے بعد کی پانچ اسمبلیوں نے سندِ جواز بخش کر صدارتی آرڈیننس سے حدود کا درجہ دیا، تین بار مختلف اسمبلیوں میں ان قوانین میں ترمیم کا بل پیش ہوا جسے سندِ قبولیت نہ مل سکی، تو اس کے بالمقابل وہ ''خدائی ترامیم'' جو اپنے یومِ آغاز سے پوری قوم کو منتشر کر چکی ہیں، اُن کی کیا حیثیت ہے؟ اِن کا ثمرہ یہ ہے کہ پوری قوم میں ہر جگہ مباحثہ ومجادلہ کی کیفیت طاری ہوچکی ہے۔

۲) دعویٰ کیا گیا کہ یہ قانون خواتین کے تحفظ کے لیے ہے۔ جبکہ موجودہ قانون کی صورت میں زنا کرنے والے مرد کے خلاف شکایت کو ناممکن بنا کر خواتین پر مزید ظلم کیا جارہا ہے۔ آخر کار یہ بل ''تحفظِ حقوقِ نسواں'' کے بجائے ''بدکاری لائسنس'' قرار پائے گا جس سے پاکستان میں خواتین کی حرمت وتقدس پامال ہونے کا خطرہ کہیں زیادہ بڑھ جائے گا۔

۳) پروپیگنڈا کیا گیا کہ بل میں کتاب وسنت کے خلاف ایک بھی شق نہیں ہوگی، لیکن بل میں بعض ترامیم اسلامی احکامات کے صریح خلاف ہیں اور جرائم کی سزاؤں کا ایسا طریق کار وضع کیا گیا ہے کہ عملاً سزا کا امکان ہی باقی نہیں رہتا۔ بل کے اس مختصر جائزے سے یہ بھی بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ترامیم حدود آرڈیننس کی بجائے حدود اللہ میں کی گئی ہیں۔ یہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی تعلیمات سے بغاوت اور کافرانہ فعل ہے۔ اللہ کے کسی حکم پر عمل درآمد نہ کرنا بھی گناہ ہے، لیکن اُسے منسوخ کر دینا طغیانی اور کفر کے ذیل میں آتا ہے۔

۴) اس بل میں جرمِ زنا کی رپورٹ اور سزا کا طریقِ کار اس قدر پیچیدہ ہے کہ مجرم کے لیے سزا پانے کا امکان ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ ملک میں بے راہ روی کے مزید فروغ اور فحاشی وبے حیائی کی صورت میں نکلے گا۔ بے راہ روی کا مَردوں کے بجائے عورتوں کو زیادہ نقصان ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہم تیزی کے ساتھ مغرب کے بے حیا کلچر کو اپنے معاشروں میں فروغ دے رہے ہیں۔ اسی کے مظاہر ہیں اسمبلیوں میں خواتین کے لیے ۳۳ فیصد نشستیں، الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر فحاشی کا طوفان، ہورڈنگز پر نیم عریاں تصاویر، میراتھن ریسز کا

انعقاد اور اب نام نہاد تحفظِ حقوقِ نسواں بل کی منظوری۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اراکین اسمبلی اور حکمرانوں کو ہدایت دے کہ وہ چند روزہ اقتدار کے لیے اللہ کی حدود سے یہ مذاق اور کھیل بند کریں۔ اللہ کی گرفت دنیا میں بھی سخت ہے اور آخر کار روزِ محشر سب کو اس کے حضور جواب دہ ہونا ہی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ (النور:۱۹)

''بلا شبہ جو لوگ چاہتے ہیں کہ اہل ایمان میں فحاشی پھیلے' ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔''

تحفظِ حقوقِ نسواں کے لیے کرنے کے کام

حکومت نے تحفظِ حقوقِ نسواں بل پر مشاورت کے لیے چند جید علمائے کرام پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی تھی۔ اس کمیٹی میں مفتی محمد تقی عثمانی صاحب' مفتی منیب الرحمٰن صاحب' ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب' مولانا محمد حنیف جالندھری صاحب' مولانا زاہد الراشدی صاحب' مفتی غلام الرحمٰن صاحب اور مولانا محمد حسن جان صاحب شامل تھے۔ اس کمیٹی نے حکومت کو تحفظِ حقوقِ نسواں کے لیے مندرجہ ذیل سفارشات پیش کی تھیں :

(i) خواتین کو عملاً وراثت سے عام طور پر محروم رکھا جاتا ہے۔ اس کے سدِّ باب کے لیے مستقل قانون بنایا جائے۔ خاص طور پر جاگیردار معاشرہ میں عورتوں کو وراثت سے محروم کر کے زرعی جائیداد کو اپنے خاندان میں روکے رکھنے کے لیے قرآن سے شادی کا غیر اسلامی تصور اپنایا جاتا ہے' اِسے تعزیری جرم قرار دیا جائے۔

(ii) وٹہ سٹہ کی شادی جس میں متبادل رشتوں کے طور پر عورتوں کا نکاح کر لیا جاتا ہے اور عورتیں مہر سے محروم رہتی ہیں' اِسے تعزیری جرم قرار دیا جائے۔

(iii) کاروکاری کے لیے عبرتناک سزا تجویز کی جائے اور برسرِ عام دی جائے۔

(iv) عورتوں کی خرید و فروخت اور انہیں میراث بنانے کے غیر شرعی رواج اور رسوم کا قانونی سدِّ باب کیا جائے۔ بعض علاقوں میں مہر عورت کی بجائے اس کے والد یا ولی لیتے ہیں' اِسے جرم قرار دیا جائے۔

(v) عاقلہ بالغہ خاتون کی شادی اگر اس کی رضامندی کے بغیر کی جائے تو اسے تعزیری جرم قرار دیا جائے۔

(vi) بیک وقت تین طلاق دینے کو تعزیری جرم قرار دیا جائے' اور جو نوٹری پبلک یا اوتھ کمشنر یا وثیقہ نویس ایک وقت میں تین طلاق کی دستاویز مرتب کرے اسے بھی شریک جرم قرار دیا جائے۔

اسلام دشمن طاقتوں کی خوشنودی کی خاطر اسلامی جمہوریہ پاکستان میں روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے نام پر مغرب کے بے حیا کلچر کو فروغ دینے والے حکمرانوں کو اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور اس کی سزا سے ڈرنا چاہیے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَـهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَـهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿١٤﴾﴾ (النّساء)

''اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی طے کردہ حدود کو پامال کرے گا اللہ اُسے دوزخ میں ڈالے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا' اور اُس کو ذلت کا عذاب ہوگا''۔

کیا تمام مذاہب برحق ہیں؟

(نظریۂ وحدتِ اَدیان کا تجزیہ)

حافظ طاہر اسلام عسکری☆

زیرِنظر تحریر کا اصل محرک شہزادہ چارلس کا ایک خطاب بنا جو انہوں نے چند ماہ قبل ازہر یونیورسٹی (قاہرہ) مصر میں کیا۔ اپنے اس خطاب میں انہوں نے ''وحدتِ مذاہب سماویہ'' کا تصور پیش کیا۔ یہ مضمون انہی دنوں مکمل کرلیا گیا تھا لیکن بوجوہ شائع نہ ہوسکا۔ ابھی حال ہی میں پاکستان آمد پر موصوف نے پھر انہی خیالات کا اعادہ کیا جس سے یہ موضوع پھر سے مختلف حلقوں میں زیربحث ہے۔ موقع کی مناسبت سے یہ تحریر نذرِ قارئین ہے۔ (مضمون نگار)

دُنیا میں بسنے والے انسانوں کی عظیم اکثریت کسی نہ کسی مذہب سے وابستہ ہے' اس لیے کہ مذہب ایک فطری شے ہے۔ دنیا میں ایک پُرامن معاشرے کے قیام کے لیے ایک دوسرے کے افکار وعقائد کے حوالے سے تحمّل' برداشت اور رواداری کا رویہ اپنانا ازبس ضروری ہے۔ کسی عقیدہ وفکر کو اپنانا اور دیگر افکار ونظریات سے اختلاف کرنا ہر شخص کا مسلّمہ حق ہے' اور اگر اختلاف حدود وآداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے سلیقے سے کیا جائے تو اس سے مزید غور وفکر اور مفاہمت کی راہیں کھلتی ہیں' مگر اختلاف کی رو میں بہہ کر شائستگی اور توازن کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا اور دلیل و برہان کی بجائے طعن وتشنیع کا انداز اختیار کرنا فریقین کو باہم دوری کی طرف تو لے جاسکتا ہے لیکن اس سے کسی مفید نتیجے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ مختلف مذاہب کے مابین رواداری اور مثبت مکالمے کے کلچر کو فروغ دینا ہمیشہ کی طرح آج بھی' بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر' وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور یہ بات خوش آئند ہے کہ ہر مذہب

☆ ریسرچ ایسوسی ایٹ قرآن اکیڈمی لاہور

سے متعلق سنجیدہ دانشور اور علماء اس حوالے سے کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ (۱) لیکن اس سلسلے میں ایک نظریہ ''وحدتِ ادیان'' کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک اہم بنیاد، دیگر بہت سی غلط فہمیوں کے علاوہ، یہ ہے کہ مختلف اہل مذاہب میں پائے جانے والے عناد و تعصب کو ختم کر کے ان میں باہمی محبت و یگانگت اور رواداری کے ماحول کو فروغ دیا جا سکے۔ یہ نظریہ جہاں ایک طرف بالکل بے بنیاد اور غیر حقیقت پسندانہ ہے وہیں دعوتِ اسلامی کی تبلیغ و ترویج کے لیے بھی ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ زیرِ نظر تحریر میں اسی نظریے کا تجزیہ مقصود ہے۔

نظریۂ وحدتِ اَدیان

اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں موجود تمام ادیان و مذاہب درحقیقت ایک ہی مقصود کو پانے کے مختلف راستے ہیں۔ ظاہراً مختلف نظر آنے والی یہ راہیں دراصل ایک ہی منزل تک پہنچاتی ہیں، اور یہ بات ظاہر ہے کہ جب ایک منزل تک متعدد راستوں سے پہنچنا ممکن ہو تو محض کسی ایک پر اصرار کرنا کسی طور مناسب نہیں۔ حق تمام مذاہب میں موجود ہے۔ ہر مذہب خدمتِ خلق، عدل و انصاف، انسان دوستی اور بھائی چارے کی تعلیم دیتا ہے۔ تمام مذاہب کا سرچشمہ ایک ہی بزرگ و برتر اور مقدس ذات ہے، جسے عربی میں اللہ، فارسی میں خُدا، ہندی میں بھگوان اور انگریزی میں گاڈ (God) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جس طرح پانی کے لیے مختلف زبانوں میں مختلف الفاظ استعمال کرنے سے پانی کی حقیقت نہیں بدلتی، اور وہ پانی ہی رہتا ہے، اسی طرح خُدا بھی درحقیقت ایک ہی ہے اور سارے مذاہب اسی ایک ہستی کی خوشنودی کے حصول کے مختلف ذرائع ہیں، لہٰذا کسی مذہب کے متبعین کا یہ نقطۂ نظر کہ حق صرف انہی کے پاس ہے، ایک بے جا تشدد ہے، جس سے مختلف مذاہب میں ٹکراؤ کا پہلو نکلتا ہے اور ان مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان امن و آشتی اور پُرامن بقائے باہمی کے عظیم مقصد کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے۔ چونکہ تمام مذاہب میں احترامِ انسانیت کا درس یکساں طور پر موجود ہے، لہٰذا تمام مذاہب کا احترام اور ان کی یکساں صداقت کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ یہی حصولِ امن کا واحد طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تمام راستے اختلاف و انتشار اور تشتت و افتراق پر منتج ہوتے ہیں، اس لیے ان سے بچنا ضروری ہے۔ (۲)

بحث کو آگے بڑھانے سے قبل یہاں اس بات کی نشاندہی مناسب ہوگی کہ یہ نظریہ اگرچہ مختلف لوگوں کی طرف سے پیش کیا گیا ہے، لیکن برعظیم پاک و ہند میں اس کی اصل بنیاد ہندو مفکرین نے رکھی۔ اس کے بنیادی طور پر دو اسباب ہیں:

(۱) ایک تو ہندو مذہب کی داخلی طور پر ناہمواریاں اور معذوریاں، جن کی بنا پر یہ وسیع بنیادوں پر کوئی معاشرہ تشکیل دینے سے قاصر ہے۔

(۲) دوسرا سبب یہ ہے کہ ہندو اپنے مذہب کے شیدا اور رسیا ہونے کے باوجود اس حقیقت سے باخبر تھے کہ ان کا مذہب ریاست و سیاست کے معاملات سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

اس کے بالمقابل اسلام جیسا جامع اور ہمہ گیر دین موجود تھا جو ہر شعبۂ زندگی سے متعلق کامل رہنمائی عطا کرتا ہے۔ لہٰذا ریاست و معاشرہ کو اسلام کے اثرات سے بچانے کے لیے وحدتِ اَدیان کے نظریہ کا سہارا لیا گیا تاکہ ریاست و مذہب کو ایک دوسرے سے کلیتاً کاٹ کر ہندو مذہب کی کمزوریوں اور خامیوں پر پردہ ڈالا جا سکے۔

وحدتِ اَدیانِ سماویہ

گزشتہ سطور میں جس نظریے کا خلاصہ بیان کیا گیا وہ تو اتنی وسعت کا حامل ہے کہ دنیا کے ہر مذہب کو برحق تسلیم کرنے پر زور دیتا ہے، لیکن بعض مفکرین نے یہاں تھوڑی سی ترمیم کر کے ایک اور نظریہ ''وحدتِ مذاہبِ سماویہ'' کے نام سے پیش کیا ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ وہ تمام مذاہب جن کی بنیاد وحی و الہام پر ہے (یعنی یہودیت، عیسائیت، اسلام) سارے یکساں طور پر برحق اور قابلِ عمل ہیں، ان میں سے کسی بھی ایک کی پیروی کر کے نجات حاصل کی جا سکتی ہے، باقی رہا ان میں پایا جانے والا اختلاف، تو وہ محض تنوع کا ہے اور ہمیں اس تنوع کو برقرار رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے مفاہمت کا رویہ اپنانا چاہیے۔[۳]

مذکورہ بالا نظریہ درحقیقت مذاہب عالم کے سطحی مطالعے اور ان میں پائے جانے والے اختلافات کے حقیقی تجزیے سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مختلف مذاہب میں پایا جانے والا اختلاف انتہائی بنیادی اور جوہری نوعیت کا ہے جس کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں۔[۴] کسی بھی دوسرے نظامِ فکر و عمل کی طرح مذاہب میں بھی اصل حیثیت ان کے عقائد اور بنیادی تصورات کو حاصل ہے۔ مختلف مذاہب میں اتحاد یا اختلاف کی نوعیت متعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اساسات و کلیات اور بنیادی عناصر ترکیبی کا بے لاگ اور دیانت دارانہ تجزیہ کیا جائے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے محض ان مذاہب کی جزوی اور فروعی تعلیمات کو دیکھ کر ان کے یکساں ہونے کی بات کرنا ایک فاش غلطی ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے بکری اور ہرن کی کچھ ظاہری مشابہت کی بنا پر ان کے ایک ہونے کا حکم لگا دیا

جائے۔ اگر اسی معیار کو اپنا لیا جائے تو شاید کسی بھی شے کو دوسری سے جدا نہ کیا جا سکے۔

دلائل کا تجزیہ

پہلی دلیل

''نظریۂ وحدتِ اَدیان'' کے حاملین کی بنیادی دلیل قرآن مجید کی درج ذیل آیت ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحاً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلاَ خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلاَ هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾﴾

ایک صاحب لکھتے ہیں:

''آنحضرت ﷺ مبعوث ہوئے تو آپؐ نے بحکم الٰہی یہودی وعیسائی وصابئ کو نہ صرف حق پر قائم کیا بلکہ ان کو اپنی اطاعت مذہبی سے بھی مستثنیٰ کیا اور علی الاعلان فرمایا کہ:

''بے شک وہ جو ایمان لے آئے ہیں اور وہ جو یہودی ہیں اور وہ جو نصاریٰ (مسیحی) ہیں اور وہ جو صابئ ہیں' ان میں سے ہر وہ شخص جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور عمل صالح کرتا رہتا ہے' تو ایسے لوگوں کے لیے ان کے ربّ کے پاس اجر ہے' ان کے لیے نہ تو اُن پر خوف کا تسلط ہوگا' نہ وہ غم زدہ ہی ہوں گے۔'' (البقرۃ:۶۲)

اس سے متصلاً بعد بائبل سے اسی تصور کو ثابت کرنے کے لیے اقتباسِ ذیل نقل کرتے ہیں:

''خدا کسی کا طرف دار نہیں' بلکہ ہر قوم میں جو اس سے ڈرتا ہے اور راست باز ہے وہ اس کو پسند ہے۔ (بائبل' اعمال الرسل' باب ۱۰' آیت ۳۵)''(۵)

تجزیہ

اس آیت سے بہت سے لوگوں کو مغالطہ لگا ہے اور اس کا صحیح مدعا نہ سمجھنے کی بنا پر اس سے وحدتِ ادیان کا فلسفہ کشید کر لیا گیا ہے۔ کسی بھی کلام کا صحیح مفہوم متعین کرنے کے لیے یہ امر انتہائی ضروری ہوتا ہے کہ منشائے متکلم کو مدنظر رکھا جائے' نیز ایک طویل کلام سے چند جملوں کو سیاق وسباق سے کاٹ کر اس سے کوئی مطلب اخذ کرنا' خصوصاً جب وہ منشائے متکلم سے صریحاً متصادم ہو' تعبیر وتشریح کے مسلّمہ اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ اپنے خود ساختہ نظریات کی سند قرآن مجید سے لینے کے لیے کلامِ الٰہی کی تعبیر وتفہیم

میں اس غلطی کا ارتکاب بڑی بے احتیاطی سے کیا جاتا ہے اور یہی معاملہ اس آیۂ مبارکہ کی تفسیر کے سلسلہ میں پیش آیا ہے۔ ذیل میں اس آیت کے حقیقی مدعا کو واضح کیا جاتا ہے۔

سیاقِ کلام کو ملحوظ رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت سے پہلے یہود کی بدعملیوں اور سرکشیوں کو بیان کر کے ان کے مستحق عذاب ہونے کا ذکر ہے۔ اس سے یہ الجھن پیدا ہوسکتی ہے کہ ان یہود میں جو لوگ کتابِ الٰہی کے صحیح پیرو اور اپنے پیغمبر کی ہدایات کے مطابق زندگی گزارنے والے تھے ان کے ساتھ اللہ کیا معاملہ فرمائے گا؟ اللہ نے اس کی وضاحت فرمادی کہ صرف یہود ہی نہیں، نصاریٰ اور صابی بھی اپنے اپنے وقت میں، جنہوں نے اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھا اور نیک عمل کرتے رہے وہ سب نجاتِ اُخروی سے ہمکنار ہوں گے اور اسی طرح اب رسالتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانے والے مسلمان بھی اگر صحیح طریقے سے ایمان باللہ والیوم الآخر اور عمل صالح کا اہتمام کریں تو یہ بھی یقیناً آخرت کی ابدی نعمتوں کے مستحق قرار پائیں گے۔ (۶)

اس آیت کا موضوع حقیقت میں یہ نہیں کہ اجزائے ایمان کی تفصیل کیا ہے، بلکہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں کوئی درجہ یا مقام کسی مخصوص خاندان یا فرقہ یا گروہ سے نسبت رکھنے کی بنا پر حاصل ہوتا ہے یا ایمان اور عمل صالح کی بنا پر؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ کی نظر میں ان نسبتوں کی کوئی حیثیت نہیں بلکہ وہ افراد سے ان کے اعمال کی بنیاد پر معاملہ کرتا ہے۔ (۷)

اس آیۂ کریمہ کے نزول کا پس منظر اس کے مفہوم کو بالکل واضح کر دیتا ہے اور وہ پس منظر یہ ہے کہ سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے اپنے ان ساتھیوں کے بارے میں پوچھا جو نمازی اور عبادت گزار تھے، یعنی بعثت نبویؐ سے قبل اپنے دین کے صحیح طور پر پابند تھے، تو مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ (۸)

جیسا کہ عرض کیا گیا، کلام کے مفہوم کی تعیین میں منشائے متکلم کی رعایت بھی ازبس ضروری ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو قرآن مجید کی کئی آیات میں تمام بنی نوعِ انسان کو نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾﴾

''آپؐ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! یقیناً میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا ہوں جس

\Ms_2006\meesaq december06\ms03-11.inp 9/20/2014 1:04 PM PAGE 3 (1,1)

کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے‘ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں‘
وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ سو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبیٔ
اُمّی پر جو کہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہیں اور اُن کا اتباع کرو تا کہ
تم راہ پر آ جاؤ۔‘‘

اس آیت سے واضح طور پر یہ ثابت ہو رہا ہے کہ نبی کریمﷺ کی رسالت عالمگیر ہے اور آپؐ پوری انسانیت کے نجات دہندہ اور رسول ہیں اور آپؐ کے دین کے علاوہ کسی مذہب میں نجات اور ہدایت نہیں۔

قرآن مجید اس تصور کی بھی واضح طور پر نفی کرتا ہے کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کو رسول کریمﷺ پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا گیا:

﴿وَاٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ﴾
(البقرۃ:٤١)

’’اور ایمان لاؤ اس چیز پر جو میں نے اتاری ہے تصدیق کرتی ہوئی اس چیز کی جو
تمہارے پاس ہے اور تم اس کے پہلے انکار کرنے والے نہ بنو۔‘‘

یہاں جس اتاری گئی چیز پر ایمان لانے کا کہا جا رہا ہے وہ قرآن مجید ہے اور اس کے انکار کو صریح کفر کہا گیا ہے اور نبی کریمﷺ پر ایمان لائے بغیر قرآن پر ایمان لانا ناممکن ہے۔[9]

اس ساری تفصیل سے واضح ہوا کہ نبی کریمﷺ نے یہود و نصاریٰ اور صابئین کو حق پر نہیں کہا اور نہ ہی اپنی اطاعت مذہبی سے مستثنیٰ کیا ہے‘ بلکہ اس آیت میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ ان میں سے جو بھی اپنے اپنے دَور کے نبی کی تعلیمات پر عمل کرتا رہا وہ نجات یافتہ ہے‘ نیز اللہ کے ہاں زبانی نسبتوں کی بجائے عمل صالح اور ایمان باللہ والیوم الآخر کامیابی کا حقیقی معیار ہیں۔

دوسری دلیل

قرآن مجید سے وحدتِ مذاہب سماویہ کے نظریے کا اثبات کرنے کے لیے درج ذیل آیات سے بھی استدلال کیا جاتا ہے:

﴿لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ
وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ

الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ (آل عمران)

''یہ سارے کے سارے یکساں نہیں' بلکہ ان اہل کتاب میں ایک جماعت (حق پر) قائم رہنے والی بھی ہے جو راتوں کے وقت بھی کلام اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدے بھی کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر بھی ایمان رکھتے ہیں' بھلائیوں کا حکم کرتے ہیں' برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں۔ اور یہی نیک بخت لوگ ہیں۔''

ان آیات سے یہ مفہوم اخذ کیا جاتا ہے کہ اہل کتاب اگر مذکورہ بالا صفات کے حامل ہوں تو وہ نجات پائیں گے' کیونکہ قرآن نے ان کو صالح (نیک بخت) کہا ہے اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کی ہدایت نہیں کی۔

تجزیہ

اگر اس آیت سے قبل کے مضمون کو مدنظر رکھا جائے تو یہ غلط فہمی خود بخود رفع ہو جاتی ہے۔ یہ آیت مذکورہ بالا سورۃ کے جس رکوع میں موجود ہے اس کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾﴾

''اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہتر تھا' ان میں ایمان لانے والے بھی ہیں لیکن اکثر تو فاسق ہیں۔''

سوال یہ ہے کہ اہل کتاب کو کس چیز پر ایمان لانے کا کہا جا رہا ہے؟ اپنی شریعت اور اپنے نبی پر تو وہ پہلے سے ایمان رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں رسول کریم ﷺ پر ایمان لانے اور اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ پھر بتایا کہ ان میں سے کچھ تو ایمان لانے والے ہیں لیکن ان کی اکثریت نافرمانوں کی ہے۔ اس کے بعد نافرمانوں کی بُری روش اور ان کی سزا کا تذکرہ کیا گیا اور آخر میں ایمان لانے والوں کا ذکر کیا کہ ان کی صفات کیا ہیں اور اللہ کے ہاں ان کا مرتبہ کیا ہے۔ لہٰذا مذکورہ آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جو رسول کریم ﷺ کی رسالت کا اقرار کر کے حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے' جیسے سیدنا عبداللہ بن سلام' سیدنا اسد ابن عبید اور سیدنا ثعلبہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم وغیرہم۔

اس سورت کے آخر میں بھی ان لوگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِنَّ مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ لَمَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِمۡ خٰشِعِيۡنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشۡتَرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾﴾

''یقیناً اہل کتاب میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور جو تمہاری طرف اُترا اور جو اُن کی جانب نازل ہوا اس پر بھی۔ اللہ سے ڈرتے رہنے والے ہیں اور اللہ کی آیتوں کو تھوڑے مول بیچتے بھی نہیں۔ ان کا بدلہ ان کے ربّ کے پاس ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔''

اس آیت سے یہ واضح ہوگیا کہ قابل تعریف اہل کتاب وہ ہیں جو قرآن پر بھی ایمان لاتے ہیں اور قرآن پر ایمان اسی صورت میں درست ہوسکتا ہے جب رسالت محمدیؐ کا اقرار کیا جائے۔ الغرض سورۂ آل عمران کی مذکورہ آیات ۱۱۳، ۱۱۴ سے وحدتِ مذاہب سماویہ کا نظریہ اخذ کرنا سیاقِ کلام سے صرفِ نظر کا نتیجہ ہے، لہٰذا غلط ہے۔

تیسری دلیل

قرآن مجید کی متعدد آیات میں انبیاء کرام علیہم السلام کو ایک ہی طریقے پر کاربند (اُمت) کہا گیا ہے، اور رسول کریم ﷺ کو دیگر انبیاء کی اتباع واقتداء کی ہدایت کی گئی ہے جس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان میں سے کسی بھی ایک نبی کی تعلیمات پر عمل فلاح ونجات کے لیے کافی ہے۔

تجزیہ

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی آیات کو قرآن مجید کی دیگر آیات سے ملا کر دیکھا جائے تو اس غلط فہمی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ آیئے ان آیات کے صحیح مفہوم پر ایک نظر ڈالیں۔

سورۃ الانبیاء میں مختلف انبیاء علیہم السلام کے تذکرے کے بعد فرمایا:

﴿اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫﴾ (آیت ۹۲)

''یہ تمہاری اُمت حقیقت میں ایک ہی اُمت ہے''۔

سورۃ الشوریٰ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوۡحًا وَّالَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ

وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ (آیت ۱۳)

''اللہ نے تمہارے لیے وہ دین ٹھہرایا ہے جس دین پر نوح کو چلنے کا حکم دیا اور جس دین کا حکم ہم نے آپ کو (اے محمدؐ) دیا اور جس دین کا ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا (سب سے یہی کہا تھا) کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالو۔''

سورۃ الانعام میں اٹھارہ نبیوں کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ﴾ (آیت ۹۰)

''یہ حضرات ایسے تھے جن کو اللہ نے ہدایت کی تھی سو آپؐ بھی ان ہی کے طریق پر چلیے۔''

انبیاء کو ایک اُمت قرار دینے کا مطلب دراصل یہ ہے کہ وہ ایک ہی طریقہ پر تھے' جیسا کہ اسی سورت میں ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ﴾ (آیت ۳۸)

''اور جو جاندار زمین میں چلتا ہے اور جو پرندہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتا ہے (ان میں سے) ہر ایک کی جماعت ہے تمہاری طرح''۔

یعنی ہر مخلوق کا اپنا طرزِ زندگی اور اندازِ بود و باش ہے اس لیے ان پر لفظ 'اُمت' کا اطلاق کیا گیا ہے۔ یہ لفظ دین کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ دین کسی جماعت کے متفقہ نظامِ فکر و عمل کو کہتے ہیں۔ درج ذیل آیت میں 'اُمت' کا معنی دین ہی ہے۔

﴿اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ .....﴾ (الزُّخرف: ۲۲)

''یقیناً ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا.....''

اب قرآن مجید میں ایک طرف تو تمام انبیاء کو ایک ہی اُمت قرار دیتے ہوئے نبی کریم ﷺ کو بھی ان کے طریقے کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے تو دوسری طرف یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ (المائدۃ: ۴۸)

''اور اگر اللہ چاہتا تو تم (یہود' نصاریٰ' مسلمان) کو ایک ہی اُمت بنا دیتا۔''

یعنی ایک اُمت نہیں بنایا اور اس کی حکمت یہ ہے کہ:

﴿وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَا اٰتٰىكُمْ﴾

''لیکن وہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے ان (احکام) میں جو تم کو اس نے دیے۔''

پھر امر واقعہ میں بھی انبیاء کی تعلیمات میں کافی اختلاف موجود ہے۔ یہاں قرآن مجید میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے جو کہ ناممکن ہے' کیونکہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہے۔

﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿٨٢﴾﴾ (النّساء)

''اور اگر یہ (قرآن) اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔''

اگر اس نکتے کو حل کر لیا جائے تو حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے قدرے تفصیل سے گفتگو کرنا ضروری ہے۔

قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تخلیق انس و جن کا مقصد محض اللہ کی بندگی کرنا ہے۔ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾﴾ (الذّٰریٰت) جن و انس کو اُن کا اصل مقصد یاد دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ نبوت و رسالت جاری کیا۔ چنانچہ ہر پیغمبر کی طرف یہی وحی کی گئی کہ وہ لوگوں تک یہ پیغام پہنچائیں کہ صرف اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔ ﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (الانبیاء) یہی وہ نقطۂ توحید ہے جو تمام انبیاء کی دعوت و تبلیغ میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور یکساں طور پر ان کے پیغام میں موجود رہا ہے۔ اسی حوالے سے نبی کریم ﷺ کو بھی ہدایت کی گئی ہے کہ آپؐ بھی اپنے سے پہلے انبیاء کی اس مشترکہ دعوت پر کاربند رہیں اور ان کے اس پیغامِ دعوت کی اقتدا کریں۔ اسی صورت کو قرآن دین سے تعبیر کرتا ہے: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ﴾ (الشوریٰ) یعنی تصورِ توحید کو قائم رکھو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالو' اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔ اس نقطے (توحید) پر انبیاء کے اتحاد و اتفاق کی بنا پر انہیں ایک ہی اُمت کہا گیا' یعنی تم ایک ہی دین پر کاربند جماعت ہو۔ ﴿اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۡ﴾

پھر قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ دین میں انبیاء کے اتحاد کے باوجود شریعت و منہاج میں ان کے مابین اختلاف تھا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾
(المائدۃ:٤٨)

''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک دستور اور راہ مقرر کر دی ہے' اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا۔''

تو معلوم ہوا کہ انبیاء کا دین تو ایک ہے لیکن شریعت و منہاج مختلف ہے۔

یہاں دین و شریعت کے فرق کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ دین کا معنی ہے اِنقیاد' یعنی کسی کے سامنے جھکنا' کسی کی اطاعت کرنا' اس لحاظ سے دین کا مفہوم یہ ہے کہ صرف اللہ کی اطاعت کی جائے اور اسی سے وابستہ ہوا جائے (یہی توحید ہے) اور اس اِنقیاد و اطاعت کے لیے جو راہ اختیار کی جائے اس کو شریعت کہتے ہیں۔ شریعت میں نمایاں ہونے کا پہلو پایا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿اِذْ تَاْتِیْهِمْ حِیْتَانُهُمْ یَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا.....﴾(الاعراف:۱۶۳)

''جب کہ ان کے ہفتہ کے روز تو ان کی مچھلیاں ظاہر ہو ہو کر ان کے سامنے آتی تھیں.....''

تو اللہ کی اطاعت و بندگی اور اس کی رضا کے حصول کے لیے جو راستہ واضح اور نمایاں طور پر اللہ کی طرف سے متعین کر دیا گیا ہو اور انقیاد باللہ کی عملی و فکری صورتیں جنہیں رسول کی ہدایات کی روشنی میں اختیار کیا جاتا ہے' اسے شریعت کہتے ہیں۔ باقی رہا منہاج تو شریعت و منہاج کے فرق کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کسی بھی منزل تک پہنچنے کے لیے ایک راستہ ہوتا ہے جسے انسان اختیار کر کے منزل تک پہنچتا ہے اور اس راستے پر چلتے ہوئے انسان کی ایک ہیئت بھی وجود میں آتی ہے۔ پس راستے کو 'شریعت' اور اس پر چلتے ہوئے انسان کی ہیئت و صورت کو 'منہاج' سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ ترجمانِ قرآن حبر الأمہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾ کی تفسیر ''سبیل و سنة'' سے کی ہے' یعنی شریعت راستہ (سبیل) ہے' اور منہاج اس پر چلنے کا انداز (سنت)۔[۱۰]

دین و شریعت کے اسی فرق کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا:

((اَلْاَنْبِیَاءُ اِخْوَةٌ مِنْ عَلَاتٍ وَاُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰی وَدِیْنُهُمْ وَاحِدٌ))[۱۱]

''تمام انبیاء علاتی بھائی ہیں' ان کی مائیں مختلف ہیں لیکن ان سب کا دین ایک ہی ہے۔''

علاتی بھائی سے مراد یہ ہے کہ مائیں مختلف ہوں اور باپ ایک ہی ہو۔ ماؤں کے مختلف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کی شریعتوں کی فروعیات و جزئیات میں تو اختلاف ہے لیکن جہاں

تک توحید اور اللہ کی عبادت و بندگی کا معاملہ ہے' تو اس کے اصولوں میں کوئی فرق و اختلاف نہیں۔ ان کے دین کے ایک ہونے سے یہی مراد ہے۔(۱۲)

اس ساری تفصیل سے واضح ہوا کہ تمام انبیاء کا مقصود و مطلوب تو ایک ہی تھا' یعنی رضائے الٰہی کا حصول اور عقیدۂ توحید کی ترویج۔ لیکن اس کے لیے ان کو مختلف زمانوں میں مختلف طریقے اور انداز خود اللہ کی طرف سے بتائے گئے اور اس میں بہت سی حکمتیں کارفرما تھیں۔

فلسفۂ نسخ

ان حکمتوں کا تعلق اصل میں فلسفۂ نسخ سے ہے' یعنی نئی شریعت کے آنے سے پہلی شریعت منسوخ کیوں ہو جاتی تھی؟ نسخ کی اصل حکمت یہ ہے کہ ابتدائے زمانہ سے انسان کی ضروریات اور حالات و کیفیات میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر دَور کے تقاضوں کے مطابق مختلف انبیاء و رُسلؑ کو مختلف شرائع عطا فرماتا رہا تاکہ لوگ آسانی سے اس پر عمل کر سکیں۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی ماہر حکیم مریض کے حالات کے تغیر کی بنا پر نسخے میں تبدیلی کرتا رہتا ہے۔ اس تبدیلی سے مقصود شفا کا حصول ہوتا ہے اور نسخے میں یہ تغیر و تبدل مریض کے حسب حال انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ جس طرح ایک نسخے کی تعیین کے بعد پہلے نسخے کو استعمال کرنا حکیم و طبیب کی ہدایت کی خلاف ورزی اور صحت کے لیے مضر سمجھا جاتا ہے اسی طرح ایک شریعت کے ہوتے ہوئے پہلی شریعت منسوخہ پر عمل کرنا بھی اللہ کے حکم کی خلاف ورزی اور رضائے الٰہی کے حصول کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رسول کریم ﷺ کی موجودگی میں تورات کی تلاوت کی تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر اظہارِ ناراضگی فرمایا اور واضح کیا کہ ''آج اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری اتباع و اطاعت کرنا لازم و ضروری ہوتا''۔ (۱۳) جب رسول کریم ﷺ کے ہوتے ہوئے کسی پہلے نبیؑ کے لیے یہ گنجائش نہیں کہ وہ آپؐ کی اطاعت سے مستثنیٰ ہو تو کسی اُمتی کے لیے اس کا تصور کس طرح ممکن ہے؟

چوتھی دلیل

وحدتِ مذاہب سماویہ کی تائید میں سورۃ النحل کی درج ذیل آیت سے بھی استدلال کیا جاتا ہے:

﴿ثُمَّ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا﴾ (آیت ۱۲۳)

''پھر ہم نے آپؐ کی جانب وحی بھیجی کہ آپ ملتِ ابراہیم حنیف کی پیروی کریں۔''

اس سے بعض حضرات کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ ابراہیمی مذاہب حقیقت میں ایک ہی ہیں اور اِن میں تنوع کا اختلاف ہے۔ اسی لیے شاید بعض لوگوں نے سنت کی تعریف میں بھی سیدنا ابراہیمؑ کو شامل کر دیا ہے۔

تجزیہ

آیت کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے لفظ 'ملت' کا معنی سمجھا جائے' تا کہ یہ بات طے ہو کہ پیروی کس شے کی ہوگی۔

ملت سے مراد ایک عقیدے ونظریے کی بنیاد پر قائم شدہ کسی جماعت کی اجتماعی ہیئت ہوتی ہے۔ اس میں اجتماعیت کا پہلو خاص طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملت کی نسبت کسی فردِ واحد کی طرف نہیں کی جاسکتی' البتہ ایسے فرد کی طرف نسبت ہوسکتی ہے جو کسی اجتماع کا نمائندہ ہو' جیسے ملۃ ابراہیمؑ۔ اور جیسے ابوطالب نے کہا تھا کہ میں ملت عبدالمطلب پر فوت ہوتا ہوں۔ اسی طرح کسی جزوی عمل پر بھی ملت کا اطلاق نہیں ہوتا' جیسے 'اَلصَّلٰوۃُ مِلَّۃٌ' کی ترکیب غلط ہے۔ (۱۴)

لغت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملت میں اجتماعیت کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ ایک چیز کو اگر چاروں طرف سے بھاپ دے کر پکایا جائے تو اسے مَلَّۃٌ کہتے ہیں۔ اسی طرح کپڑے سیتے وقت بڑے بڑے پیوند لگا کر جو نقوش قائم کیے جاتے ہیں اس کے لیے کہتے ہیں: مل الثوب۔ لفظ ''ملال'' بھی اسی سے ہے کہ انسان کو اضطراب و پریشانی ہر طرف سے گھیر لیتی ہے۔ البتہ ملت میں چونکہ بنیادی تصور اجتماعیت کا ہوتا ہے اس لیے ملۃ اللہ نہیں کہا جاسکتا' کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی اجتماعیت کا حصہ نہیں۔

لفظ 'ملت' کے اس مفہوم کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر اس آیت کا مدعا متعین کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی اطاعت میں جو ایک اجتماعی رویہ و کردار پیش کیا اس کی پیروی کی جائے' چنانچہ اس میں مجموعی و اجمالی طور پر پیروی ہوگی' اس لیے کہ جزئیات کے لیے تو ویسے بھی یہ لفظ مستعمل نہیں۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ لغوی طور پر تو اگرچہ ''ملت'' اور ''دین'' میں فرق ہے لیکن بسا اوقات لفظ ''ملت'' دین کی جگہ بھی استعمال ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وسیع تر تناظر میں ملت دین کا حصہ ہوتی ہے۔ چنانچہ سورۃ النحل کی مذکورہ آیت میں مفسرین نے ملت ابراہیم سے مراد دین

لیا ہے اور یہ بات اوپر واضح کی جا چکی ہے کہ تمام انبیاء کا دین ایک ہی ہے اور خصوصیت کے ساتھ ملت ابراہیم کی ترکیب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی امتیازی اور خصوصی فضیلت کے اظہار کے لیے ہے۔ (واللہ اعلم)

نظریۂ وحدتِ اَدیان کی غیر معقولیت

بظاہر سادہ اور بے ضرر آنے والا یہ نظریہ اپنے نتائج کے اعتبار سے انتہائی بھیانک اور خطرناک ہے۔ اس کے درست ہونے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ پوری کائنات اور اشرف المخلوقات انسان کسی ذی شعور و ذی ارادہ ہستی کے دست قدرت کا نتیجہ نہیں، تخلیق کائنات کا کوئی مقصد ہے نہ انسان کا، انسان، جو دیگر مخلوقات سے عقل و فہم، ارادہ و اختیار اور خیر و شر کے انتخاب کی صلاحیت میں یکتا ہے، اپنی زندگی میں کسی ضابطے کا پابند نہیں، وہ ایک خدا کی عبادت کرنا چاہے یا دو کی، تین کی الوہیت کا قائل ہو یا لاکھوں معبودوں کی پرستش کرے یا سرے سے کسی خدا کا قائل ہی نہ ہو اور الحاد و دہریت کی زندگی گزارنا چاہے تو وہ آزاد ہے اور اپنے اس رویے پر کسی ہستی کو جوابدہ نہیں۔ اس فلسفہ کے مطابق یا تو یہ کائنات بے خدا ہے یا خدا ہے بھی تو وہ معاذ اللہ ایسا ہے کہ اس کی کوئی پسند یا ناپسند نہیں جس پر اسے اصرار ہو اور اس نے ہر ایک کو الل ٹپ آزادی سے زندگی گزارنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ (۱۵)

اس کے برعکس اسلام کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو انسان کی خدمت کے لیے اور انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور اس کے لیے ایک ضابطۂ زندگی مقرر کیا ہے جس سے اس کو آگاہ کرنے کے لیے سلسلۂ نبوت و رسالت جاری کیا، جو سیدنا آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر سیدنا محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ جو انبیاء کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرتا رہا اسے وہ انعامات سے نوازے گا اور جس نے ان کی خلاف ورزی کی اسے سزا دے گا۔

وحدتِ اَدیان نہیں، وحدتِ دین

اسلام کے نقطۂ نظر سے وحدتِ ادیان کا نظریہ بالکل بے بنیاد، غیر حقیقت پسندانہ اور باطل فلسفہ ہے۔ وہ وحدتِ ادیان کی بجائے وحدتِ دین کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام انبیاء انسانوں کو اللہ سے وابستہ کرنے کے لیے آئے تھے۔ یہی دین کی حقیقت ہے۔ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران: ۱۹) ہر نبی کا دین اسلام تھا، اس کے جانے کے بعد لوگوں نے اسے یہودیت، عیسائیت اور صابئیت

وغیرہ میں تبدیل کرلیا۔ آج اگر کوئی فلاح ونجات کی راہ پانا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو اور رسول کریم ﷺ کی رسالت کا اقرار کرے۔ اس لیے کہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾(آل عمران:۸۵)

''اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی دین تلاش کرے تو اس کا دین قبول نہیں کیا جائے گا۔''

اور اسلام مکمل نہیں جب تک رسالت محمدی کا اقرار نہ ہو۔ معروف حدیث نبویؐ ہے:

((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)) (۱۶)

اسی لیے رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

((وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَا يَسْمَعُ بِيْ اَحَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ يَهُوْدِيٌّ وَلَا نَصْرَانِيٌّ ثُمَّ يَمُوْتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِيْ اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَّا كَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ)) (۱۷)

''اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! اس اُمت میں جو کوئی بھی میری بات سن لے، وہ یہودی ہو یا عیسائی، پھر وہ اس حال میں مرے کہ مجھ پر نازل کردہ (یعنی قرآن مجید) پر ایمان نہ لایا ہو تو وہ آگ والوں میں ہوگا''۔

مذکورہ بالا بحث کا حاصل یہ ہے کہ اسلام میں 'وحدتِ ادیان' کے نظریہ کی قطعاً گنجائش نہیں، بلکہ اسلام اس کی شدت سے نفی کرتا ہے۔

عصر حاضر میں مذاہب عالم کے اتحاد کی بھی واحد صورت یہ ہے کہ وحدتِ دین کے تصور کو زیادہ سے زیادہ اُجاگر کیا جائے کہ سب مذاہب کا دین ایک تھا۔ یہ پگڈنڈیاں تو بعد میں پیدا ہوئی ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰـكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا.....الآية﴾ (آل عمران:۶۷) جب مسلمان ہیں تو پھر جھگڑا کس بات کا؟ یہ وحدتِ دین کا وہ حقیقی تصور ہے کہ جس کی طرف قرآن ہمیں لے کر آتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا

فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴿۶۴﴾ (آل عمران)

''آپؐ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب! ایسی انصاف والی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں برابر ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو ہی ربّ بنالیں۔ پس اگر وہ مُنہ پھیر لیں تو تم کہہ دو (اے مسلمانو!) کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔''

حوالہ جات:

۱) اوسلو، ناروے میں منعقدہ بین المذاہب کانفرنس (جون ۲۰۰۴ء) اور اعلانِ اوسلو کے تحت ورلڈ کونسل آف ریلیجنز برائے عالمی امن وعدل اجتماع، کے زیر اہتمام نیشنل لائبریری ہال اسلام آباد میں منعقدہ کانفرنس (ستمبر ۲۰۰۴ء) اس کی نمایاں مثال ہیں۔

۲) ڈاکٹر بھگوان داس کی انگریزی کتاب Essential Unity of all Religions (جملہ مذاہب کی بنیادی وحدت)

۳) (ا) ایک عیسائی عالم کی کتاب 'وحدۃ الادیان و وحدۃ الایمان فی التوراۃ والانجیل والقرآن' بحوالہ: ''وحدتِ ادیان کا نظریہ اور اسلام'' از سلطان احمد اصلاحی۔

(ب) فکر اسلامی کی تشکیل جدید، مرتبین: ضیاء الحسن فاروقی ومشیر الحق، مضمون فکر اسلامی کی تشکیل جدید اور اتحاد بین المذاہب از غیاث الدین اڈلفی۔ اس مضمون میں عمومی تصور تو تمام مذاہب کے اتحاد کا دیا گیا لیکن اسلام اور عیسائیت کے اتحاد پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ ص ۴۳۸۔

(ج) حال ہی میں شہزادہ چارلس نے بھی اس تصور کو پیش کیا ہے۔ دیکھئے ماہنامہ ترجمان القرآن، جون ۲۰۰۶ء میں ان کا خطاب بعنوان تصادم نہیں مفاہمت، ص ۶۷۔

۴) تفصیل کے لیے دیکھئے سلطان احمد اصلاحی کی کتاب ''وحدت ادیان کا نظریہ اور اسلام''۔ ص ۱۴ تا ۵۶، کتاب 'بقامت کہتر بقیمت بہتر' کا مصداق ہے۔ زیر نظر مضمون میں اسی سے بطور خاص استفادہ کیا گیا ہے۔

۵) فکر اسلامی کی تشکیل جدید، ص ۴۴۰، ۴۴۱، مضمون: غیاث الدین اڈلفی۔

۶) حافظ صلاح الدین یوسف، تفسیر احسن البیان، مذکورہ آیت۔

۷) امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، ۱/ ۲۳۲۔

۸) ابن کثیر، تفسیر قرآن العظیم، مذکورہ آیت۔

۹) تفصیل کے لیے دیکھئے تدبر قرآن ۱/ ۲۳۲۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اپنی تفسیر میں ''کیا اہل کتاب کے لیے رسول اللہ (ﷺ) پر ایمان لانا ضروری نہیں؟'' کے عنوان کے تحت قرآنی دلائل کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ پر ایمان نجات کے لیے ضروری ہے۔ بحث

انتہائی نفیس اور لائق مطالعہ ہے۔ دیکھئے: جلد اول، ص ۲۳۱ تا ۲۳۶۔

۱۰) (ا) ڈاکٹر عبدالعزیز بن عبداللہ الحمیدی، تفسیر ابن عباس و مروياته فی التفسير من كتب السنة۔ ۳۳۸/۱۔

(ب) صحيح البخاری، كتاب الايمان، الباب الاول۔

۱۱) صحيح البخاری، كتاب احاديث الانبياء، باب قول اللّٰه: و اذكر فِی الكتاب مريم اذ انتبذت من اهلها۔ و صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب فضائل عيسىٰ عليه السلام۔

۱۲) نوویؒ، شرح صحیح مسلم، حدیث مذکور۔

۱۳) سنن الدارمی ۱۱۵/۱، ۱۱۶۔ حسنه الالبانیؒ فی المشكوٰة۔ انظر مشكوٰة المصابيح ۱/ ۶۳ بتحقيق الالبانیؒ۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلی شریعتوں پر عمل نہ کرنے کی اصل وجہ ان کا تحریف شدہ ہونا نہیں بلکہ منسوخ ہونا ہے۔

۱۴) راغب اصفہانی، مفردات القرآن۔

۱۵) سلطان احمد اصلاحی، وحدتِ ادیان کا نظریہ اور اسلام، ص ۵۷، ۵۸۔

۱۶) صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان الايمان والاسلام والاحسان۔

۱۷) صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب وجوب الايمان برسالة نبينا محمدﷺ الى جميع الناس۔

.....☆☆.....

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی!

عتیق الرحمٰن صدیقی

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اپنے حقیقی بندوں کی ایک خصوصیت یوں بیان فرمائی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا﴾ (الفرقان)

''اور جو راتیں اپنے ربّ کے آگے سجدہ و قیام میں گزارتے ہیں۔''

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس آیۂ کریمہ کی تشریح ذیل کے اِن الفاظ میں کی ہے:

''اُن کی راتیں نہ عیاشی میں گزرتی ہیں' نہ ناچ گانے میں' نہ لہو ولعب میں' نہ گپوں اور افسانہ گوئیوں میں اور نہ ڈاکے مارنے اور چوریاں کرنے میں۔ جاہلیت کے ان معروف مشاغل کے برعکس یہ اس معاشرے کے وہ لوگ ہیں جن کی راتیں خدا کے حضور کھڑے' بیٹھے' لیٹے دعا اور عبادت کرتے گزرتی ہیں۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ ان کی زندگی کے اس پہلو کو نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ السجدۃ میں فرمایا: ﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا﴾ (آیت ۱۶) ''ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں' اپنے ربّ کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے رہتے ہیں۔'' اور سورۃ الذّٰریٰت میں فرمایا: ﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝﴾ ''یہ اہل جنت وہ لوگ تھے جو راتوں کو کم ہی سوتے تھے اور سحر کے اوقات میں مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔'' اور سورۃ الزمر میں ارشاد ہوا: ﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَائِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ﴾ (آیت ۹) ''کیا اُس شخص کا انجام کسی مشرک جیسا ہو سکتا ہے جو اللہ کا فرماں بردار ہو' رات کے اوقات میں سجدے کرتا اور کھڑا رہتا ہو' آخرت سے ڈرتا ہو اور اپنے ربّ کی رحمت کی آس لگائے ہوئے ہو؟''

(تفہیم القرآن' جلد سوم' الفرقان' حاشیہ ۸۱)

صاحب ضیاء القرآن رحمٰن کے بندوں کی اس صفت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب دنیا خوابِ راحت کے مزے لوٹ رہی ہوتی ہے تو وہ جاگ کر اپنے پروردگار کو یاد کر رہے ہوتے ہیں۔ اپنے خالق کی ناراضگی کے خوف سے ان کی آنکھیں نمناک ہوتی ہیں' کبھی سجدہ ریز ہو کر اس کی پاکی اور کبریائی بیان کر رہے ہوتے ہیں اور کبھی ادب وتواضع کی تصویر بن کر دست بستہ اس کے حضور کھڑے ہوتے ہیں اور ان کی راتیں اسی حالت میں گزر جاتی ہیں۔ کسی کافر نے صحابہ کرام ﷺ کے لشکر میں چند راتیں اور چند دن بسر کیے اور جا کر اپنے بادشاہ کو بتایا ''هُمْ فُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ وَرُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ'' کہ وہ سارا دن برق رفتار گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر دادِ شجاعت دیتے ہیں اور رات کے وقت راہبوں کی طرح ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں''۔

(ضیاء القرآن' جلد سوم' الفرقان' حاشیہ ۶۳)

مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں:

''سُجَّدًا وَّقِيَامًا'' کے اسلوبِ بیان سے جو شوق واضطراب نمایاں ہو رہا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے' ظاہر ہے کہ اس سے صرف فرض نمازیں مراد نہیں ہیں بلکہ یہ تہجد کے سجود وقیام کی شب بیداریوں اور بے قراریوں کی تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی راتیں نہ عیش کدوں میں گزارتے ہیں اور نہ نرم وگرم بستروں میں دنیا و عاقبت سے بے فکر ہو کر سوتے ہیں' بلکہ راتوں میں اٹھ اٹھ کر عذابِ جہنم سے بچائے جانے کے لیے دعائیں کرتے ہیں''۔ (تدبر قرآن' الفرقان)

﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ.....﴾ (السجدۃ:۱۶) کی توضیح کرتے ہوئے صاحبِ تفہیم القرآن لکھتے ہیں:

''ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ دن بھر اپنے فرائض انجام دے کر جب وہ فارغ ہوتے ہیں تو اپنے ربّ کے حضور کھڑے ہو جاتے ہیں' اس کی یاد میں راتیں گزارتے ہیں' اس کے خوف سے کانپتے ہیں اور اسی سے ساری امیدیں وابستہ کرتے ہیں۔ بستروں سے پیٹھیں الگ رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ راتوں کو سوتے ہی نہیں ہیں' بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ راتوں کا ایک حصہ خدا کی عبادت میں صرف کرتے ہیں۔''

(تفہیم القرآن' سورۃ السجدۃ' حاشیہ ۲۷)

سورۃ الذّٰریٰت میں اہل تقویٰ کی اسی صفت کو یوں اُجاگر کیا گیا ہے:

﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾

''راتوں کو کم ہی سوتے تھے' پھر وہی رات کے پچھلے پہروں معافی مانگتے تھے''۔

صاحب تفہیم القرآن اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''مفسرین کے ایک گروہ نے اس آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات بھر سو کر گزار دیں اور اس کا کچھ نہ کچھ حصہ' کم یا زیادہ' ابتدائے شب میں یا وسط شب میں یا آخر شب میں جاگ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف نہ کریں۔ یہ تفسیر تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ حضرات ابن عباس' انس بن مالک' محمد الباقر' مطرف بن عبداللہ' ابوالعالیہ' مجاہد' قتادہ' ربیع بن انس وغیرہم سے منقول ہے۔ دوسرے گروہ نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ وہ اپنی راتوں کا زیادہ حصہ اللہ جل شانہ کی عبادت میں گزارتے تھے اور کم سوتے تھے۔ یہ قول حضرات حسن بصری' احنف بن قیس اور ابن شہاب زہری کا ہے..... یعنی وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو اپنی راتیں فسق و فجور اور فواحش میں گزارتے رہے اور پھر بھی کسی استغفار کا خیال تک انہیں نہ آیا۔ اس کے برعکس ان کا حال یہ تھا کہ رات کا اچھا خاصا حصہ عبادتِ الٰہی میں صرف کر دیتے تھے اور پھر بھی پچھلے پہروں میں اپنے ربّ کے حضور معافی مانگتے تھے کہ آپ کی بندگی کا جو حق ہم پر تھا اس کے ادا کرنے میں ہم سے تقصیر ہوئی''۔ (تفہیم القرآن' جلد پنجم' الذّٰریٰت' حاشیہ ۱۵' ۱۶)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے صالح' متقی اور برگزیدہ بندوں کے اس وصف خاص کا کہ ان کی راتیں اپنے ربّ کے آگے سجدہ و قیام میں گزرتی ہیں' متعدد بار ذکر فرمایا ہے۔ سجود و قیام کی یہ شب بیداری دراصل تہجد کی نماز ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے اپنی تفسیر معارف القرآن جلد پنجم میں ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ﴾ کے ضمن میں لکھا ہے کہ:

''لفظ تہجد ہجود سے مشتق ہے اور یہ لفظ دو متضاد معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی سونے کے بھی آتے ہیں اور جاگنے' بیدار ہونے کے بھی۔ اس جگہ ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ رات کے کچھ حصہ میں قرآن کے ساتھ بیدار رہا کرو' کیونکہ بِهٖ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے (مظہری)۔ قرآن کے ساتھ بیدار رہنے کا مطلب نماز ادا کرنا ہے' اسی رات کی نماز کو اصطلاحِ شرع میں نماز تہجد کہا جاتا ہے اور عموماً اس کا یہ مفہوم لیا گیا ہے کہ کچھ دیر سو کر اٹھنے کے بعد جو نماز پڑھی جائے وہ نماز تہجد ہے..... اور امام ابن کثیر نے حضرت حسن بصریؒ سے نماز تہجد کی جو تعریف نقل کی ہے وہ بھی اسی عموم پر شاہد ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: **قال الحسن البصری**

هو ما كان بعد العشاء ويحمل على ما كان بعد النوم(ابن کثیر) ''حسن بصری فرماتے ہیں کہ نماز تہجد ہر اُس نماز پر صادق ہے جو عشاء کے بعد پڑھی جائے البتہ تعامل کی وجہ سے اس کو کچھ نیند کے بعد محمول کیا جائے گا''۔

(سورۂ بنی اسراءیل' صفحہ ۵۱۵'۵۱۶)

مختصراً تہجد کے معنی ہیں نیند توڑ کر اٹھنے کے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس سے وہ نماز مراد لی گئی ہے جو شب میں کچھ سونے کے بعد اُٹھ کر پڑھی جائے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے لیے یہ نماز ضروری تھی اس لیے آپؐ نے عملاً اس کام پر مداومت فرمائی اور زندگی بھر اس کا اہتمام فرمایا۔ آپؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

((اَفْضَلُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصَّلَاةِ الْمَكْتُوْبَةِ الصَّلَاةِ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ))(۱)

''فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز درمیانی رات کی نماز (تہجد) ہے''۔

سورۂ بنی اسراءیل میں آیت کے پہلے حصے میں تہجد کا حکم دیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں نبی اکرم ﷺ کو ''مقامِ محمود'' سے نوازے جانے کے شرف سے مشرف کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾﴾

''اور (اے پیغمبر!) رات کا کچھ حصہ (یعنی پچھلا پہر) شب بیداری میں بسر کر' یہ تیرے لیے ایک مزید عمل ہے۔ قریب ہے کہ تیرا ربّ تجھے ایک ایسے مقام پر پہنچا دے جو نہایت پسندیدہ مقام ہو''۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو اوّل نماز تہجد کا حکم دیا گیا' پھر مقامِ محمود یعنی شفاعتِ کبریٰ کا وعدہ کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز تہجد کو مقامِ شفاعت حاصل ہونے میں بڑا دخل ہے۔ (معارف القرآن' ص ۵۲۰) قتادہؒ فرماتے ہیں کہ: ''قیامت کے دن سب سے پہلے زمین سے حضور ﷺ باہر آئیں گے اور سب سے پہلے شفاعت آپؐ ہی کریں گے''۔ (ابن کثیر' بحوالہ تفسیر طبری)

حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ ''جنت میں ایک اعلیٰ ترین درجہ مقامِ محمود ہے اور یہ مقام صرف ایک شخص کو دیا جائے گا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ یہ مقام مجھے عطا کیا جائے گا''۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ''مقامِ محمود'' کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

''حسن و کمال کا ایک ایسا مقام جہاں پہنچ کر محمودیت خلائق کی عالمگیر اور دائمی

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل صوم المحرم۔

مرکزیت حاصل ہو جائے گی۔ کوئی عہد ہو' کوئی ملک ہو' کوئی نسل ہو' لیکن کروڑوں دلوں میں اس کی ستائش ہو گی' اَن گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہو گی۔ 'محمود' یعنی سرتاسر ممدوح ہستی ہو جائے گی۔

ما شئت قل فيه ' فانت مصدِّقٌ

فالحُبّ يقضى والمحاسن تشهد!

یہ مقام انسانی عظمت کی انتہا ہے۔ اس سے زیادہ اونچی جگہ اولادِ آدم کو نہیں مل سکتی۔ اس سے بڑھ کر انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی سعی و ہمت ہر طرح کی بلندیوں تک اڑ کر جا سکتی ہے' لیکن یہ بات نہیں پا سکتی کہ روحوں کی ستائش اور دلوں کی مداحی کا مرکز بن جائے''۔ (تفسیر ترجمان القرآن' جلد دوم' ص ۳۹۶)

یہاں مقام محمود کی عظمت و رفعت نماز تہجد کی مناسبت سے بیان کی گئی ہے۔ یہ شانِ اَقدس اس امر کی مقتضی تھی کہ رحمان کے بندے اس کو تقربِ الٰہی کے لیے اپنا وظیفہ بناتے اور من کی دنیا اجالنے کے لیے فکرمند رہتے۔ سورۃ المزمل میں بھی اللہ نے حضور ﷺ کو مخاطب کر کے رات کو نماز میں کھڑے رہنے کی تاکید کی ہے۔ نہ صرف فہم قرآن کے لیے اسے ضروری قرار دیا گیا بلکہ نبوت کے بارگراں کے حوالے سے بھی اس عمل کو ناگزیر بتایا گیا' فرمایا: ﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا ۝﴾ ''ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے''۔

سید مودودیؒ نے ان مقامات کی نہایت خوبصورت اور جامع انداز میں توضیح فرمائی ہے' وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''قرآن کو بھاری بھرکم کلام اس بنا پر کہا گیا ہے کہ اس کے احکام پر عمل کرنا' اس کی تعلیم کا نمونہ بن کر دکھانا' اس کی دعوت کو لے کر ساری دنیا کے مقابلے میں اٹھنا' اور اس کے مطابق عقائد و افکار' اخلاق و آداب اور تہذیب و تمدن کے پورے نظام میں انقلاب برپا کرنا ایک ایسا کام ہے جس سے بڑھ کر کسی کام کا تصور نہیں کیا جا سکتا''۔
> (تفہیم القرآن' سورۃ المزمل' حاشیہ ۵)

''درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر ہے'' کے مفہوم کی وضاحت میں چار جہتوں کو مبرہن کیا گیا ہے۔

i) یہ فعل ایک ایسا مجاہدہ ہے جو نفس کو دبانے اور قابو پانے کے لیے بڑی زبردست تأثیر

رکھتا ہے۔اس طریقے سے جو شخص اپنے آپ پر قابو پالے اور اپنے جسم و ذہن پر تسلط حاصل کر کے اپنی اس طاقت کو خدا کی راہ میں استعمال کرنے پر قادر ہو جائے وہ زیادہ مضبوطی کے ساتھ دین حق کی دعوت کو دنیا میں غالب کرنے کے لیے کام کر سکتا ہے۔

ii) یہ دل اور زبان کے درمیان موافقت پیدا کرنے کا بڑا مؤثر ذریعہ ہے' کیونکہ رات کے ان اوقات میں بندے اور خدا کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہیں ہوتا اور اس حالت میں آدمی جو کچھ زبان سے کہتا ہے وہ اس کے دل کی آواز ہوتی ہے۔

iii) یہ آدمی کے ظاہر و باطن میں مطابقت پیدا کرنے کا بڑا کارگر ذریعہ ہے' کیونکہ رات کی تنہائی میں جو شخص اپنا آرام چھوڑ کر عبادت کے لیے اٹھے گا وہ لامحالہ اخلاص ہی کی بنا پر ایسا کرے گا' اس میں ریاکاری کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے۔

iv) یہ عبادت چونکہ دن کی عبادت کی نسبت آدمی پر زیادہ گراں ہوتی ہے اس لیے اس کا التزام کرنے سے آدمی میں بڑی ثابت قدمی پیدا ہوتی ہے۔ وہ خدا کی راہ میں زیادہ مضبوطی کے ساتھ چل سکتا ہے اور اس راہ کی مشکلات کو زیادہ استقامت کے ساتھ برداشت کر سکتا ہے۔ (تفہیم القرآن' جلد ششم' المزمل' حاشیہ ۶)

قرآن وسنت کی ان توضیحات سے معلوم ہوا کہ تہجد کی نماز نفس کے تزکیہ وتصفیہ' تحسین ذات' روح کی بالیدگی اور نشوو ارتقاء کے لیے نہایت ہی مفید' مؤثر اور کارگر نسخہ ہے۔ متخالف ومتبارز اور نامساعد حالات میں عزیمت واستقامت اور صبر وثبات کے ساتھ اقامتِ دین کی جدوجہد میں تعلق باللہ کا توانا اور مضبوط ہونا ناگزیر ہے' آہِ سحر گاہی کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں کہ راہ کے سنگ ہائے گراں کو فرشِ قدم بنایا جا سکے ؎

عطّار ہو' رومی ہو' رازی ہو' غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی!

عام لوگوں کے لیے یہ نماز اگرچہ ضروری نہیں ہے لیکن جو لوگ شیطانی قوتوں سے رزم آرا ہونے اور نظامِ حق کو برپا کرنے کے لیے اٹھے ہوں اُن کے لیے خدائی حمایت ونصرت حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی نماز ہے۔ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ؎

میں نے پایا ہے اسے اشک سحر گاہی میں
جس دُرِ ناب سے خالی ہے صدف کی آغوش

❁❁❁

مسلمان کا طرزِ حیات (۵۴)

علامہ ابوبکر جابر الجزائری کی شہرۂ آفاق کتاب

"مِنهاجُ المُسلم" کا اردو ترجمہ

مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

کتاب العبادات

بارہواں باب (مسلسل)

حج اور عمرہ

⑦ چوتھا رکن، وقوفِ عرفات

عرفات کے میدان میں ٹھہرنا حج کا چوتھا رکن ہے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلْحَجُّ عَرَفَةُ))(۴۲) ''حج تو عرفہ ہی ہے''۔ اس کی عملی صورت یہ ہے کہ حاجی نو ذوالحجہ کی ظہر کے بعد سے دس ذوالحجہ کی فجر تک کسی وقت وقوف کی نیت سے کچھ وقت کے لیے اس مقام میں حاضر ہو جس کا نام ''عرفات'' ہے، اگرچہ یہ حاضری ایک لحظہ بھر ہی کے لیے ہو یا اس سے زیادہ ہو۔

وقوفِ عرفات میں کچھ امور واجب ہیں، کچھ سنتیں ہیں اور کچھ آداب ہیں، جن سے یہ عمل کامل صورت میں ادا ہوتا ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

(ا) واجب اعمال

(۱) نو ذوالحجہ کو سورج ڈھلنے سے غروبِ آفتاب تک عرفات میں حاضر ہونا۔

(۲) عرفات سے واپسی پر دس ذوالحجہ کی رات مزدلفہ میں گزارنا۔

(۳) دس ذوالحجہ کو بڑے جمرہ پر کنکریاں مارنا۔
(۴) اس دن بڑے جمرہ کو کنکریاں مارنے کے بعد سر مُنڈوانا یا سر کے بال چھوٹے کروانا۔
(۵) گیارہ، بارہ، تیرہ ذوالحجہ کی تینوں راتیں منیٰ میں گزارنا۔ جو جلدی جانا چاہے اس کے لیے گیارہ اور بارہ ذوالحجہ کی دو راتیں منیٰ میں گزارنا۔
(۶) ان تینوں ایامِ تشریق (۱۱، ۱۲، ۱۳ ذوالحجہ) یا دو دن (۱۱، ۱۲ ذوالحجہ) میں روزانہ سورج ڈھلنے کے بعد تینوں جمرات پر کنکریاں مارنا۔

نوٹ: ان تمام واجب اعمال کی دلیل جناب رسول اللہ ﷺ کا عملِ مبارک ہے۔ اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا:

((لِتَاْخُذُوْا مَنَاسِكَكُمْ)) (۴۳)

''تمہیں چاہیے کہ تم (مجھ سے) اپنے مناسک (حج وعمرہ کے اعمال) سیکھ لو۔''

اور فرمایا:

((حُجُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُحُجُّ)) (۴۴)

''حج اس طرح کرو جس طرح تم نے مجھے حج کرتے دیکھا ہے۔''

اور فرمایا:

((كُوْنُوْا عَلٰى مَشَاعِرِكُمْ فَاِنَّكُمْ عَلٰى اِرْثٍ مِنْ اِرْثِ اِبْرَاهِيْمَ)) (۴۵)

''اپنے مشاعر (اعمالِ حج کے مقامات) پر ٹھہرو، تم ابراہیم علیہ السلام کی وراثت پر قائم ہو''۔

ب) مسنون اعمال

(۱) یومِ ترویہ یعنی آٹھ ذوالحجہ کو منیٰ میں جانا اور نو ذوالحجہ کی رات وہاں گزارنا، اور وہاں سے سورج طلوع ہونے کے بعد چلنا۔ اور اس طرح منیٰ میں پانچ نمازیں ادا کرنا۔
(۲) سورج ڈھلنے کے بعد نمرہ میں حاضر ہونا اور وہاں امام کے ساتھ ظہر اور عصر کی نمازیں قصر کے ساتھ جمع کر کے ادا کرنا۔
(۳) امام کے ساتھ ظہر اور عصر کی نمازیں پڑھ کر عرفات میں آ جانا، اور وہاں غروبِ آفتاب تک ذکر اور دعا میں مشغول رہنا۔
(۴) مغرب کی نماز میں تأخیر کر کے مزدلفہ میں پہنچ کر مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کر کے پڑھنا۔

(۵) ''مشعرِ حرام'' یعنی ''جبلِ قُزح'' کے پاس فجر کے بعد قبلہ رو ہو کر ذکر و دعا میں مشغول رہنا' حتیٰ کہ خوب روشنی ہو جائے۔

(۶) جمرۂ عقبہ (بڑے جمرہ) کی رمی' قربانی' سر منڈوانا' اور طوافِ زیارت یعنی طوافِ افاضہ بالترتیب انجام دینا۔

(۷) قربانی کے دن (دس ذوالحجہ کو) غروبِ آفتاب سے پہلے پہلے طوافِ زیارت کر لینا۔

ج) آداب

(۱) نو تاریخ کی صبح منیٰ سے نمرہ آتے ہوئے ''طریق ضَبّ'' نام کا راستہ اختیار کرنا۔ آنحضرت ﷺ نے ایسے ہی کیا تھا۔

(۲) وقوفِ عرفات کے لیے سورج ڈھلنے کے بعد غسل کرنا۔ یہ غسل حیض اور نفاس والی عورت تک کے لیے مشروع ہے۔

(۳) جہاں رسول اللہ ﷺ ٹھہرے تھے وہاں ٹھہرنا۔ یعنی اس بڑی اور پھیلی ہوئی چٹان کے پاس جو جبل رحمت کے نیچے عرفات کے درمیان میں ہے۔

(۴) غروبِ آفتاب تک قبلہ رو ہو کر بکثرت ذکر و دعا میں مشغول رہنا۔

(۵) عرفات سے واپسی میں ''طریق ضَبّ'' کے بجائے ''طریقِ مَأزَمَین'' کا راستہ اختیار کرنا۔ آنحضرت ﷺ عام طور پر آنے اور جانے کے لیے الگ الگ راستہ اختیار کرتے تھے۔

(۶) چلتے ہوئے آرام و سکون اور تسلی سے چلنا اور تیزی نہ کرنا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((اَیُّھَا النَّاسُ عَلَیْکُمْ بِالسَّکِیْنَۃِ فَاِنَّ الْبِرَّ لَیْسَ بِالْاِیْضَاعِ))(۴۶)

''لوگو! آرام سے چلو' نیکی بھاگنے دوڑنے کا نام نہیں ہے''۔

(۷) منیٰ اور عرفات جاتے ہوئے اور وہاں سے مزدلفہ اور پھر منیٰ آتے ہوئے بکثرت لبیک پڑھتے رہنا حتیٰ کہ بڑے جمرہ کو کنکریاں مارنا شروع کر دے۔(۴۷)

(۸) بڑے جمرہ کو رمی کرنے کے لیے مزدلفہ سے سات کنکریاں چُننا۔

(۹) مزدلفہ سے خوب روشنی ہو جانے پر سورج طلوع ہونے سے پہلے روانہ ہونا۔

(۱۰) وادیٔ محسر کی نشیبی زمین میں سے نسبتاً تیزی سے گزر جانا' اور گاڑی کی رفتار تیز کرنا بشرطیکہ کسی کو نقصان پہنچنے کا خطرہ نہ ہو۔

(۱۱) طلوعِ آفتاب سے لے کر زوال تک کسی وقت بڑے جمرہ کو رمی کرنا۔

(۱۲) رمی کرتے ہوئے ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہنا۔

(۱۳) قربانی کا جانور اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا یا ذبح اور نحر کے وقت موجود رہنا۔ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کے بعد یہ دعا پڑھنا:

اَللّٰهُمَّ هٰذَا مِنْكَ وَاِلَيْكَ، اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّيْ كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلِكَ

''اے اللہ! یہ تیری طرف سے (حاصل ہوئی) ہے، اور تیری طرف (جا رہی) ہے (یہ قربانی تو نے ہی مجھے دی ہے اور تیری ہی رضا کے لیے اسے قربان کر رہا ہوں) اے اللہ! تو مجھ سے بھی قبول کر لے جس طرح تو نے اپنے خلیل ابراہیم (علیہ السلام) کی قربانی قبول کی تھی''۔

(۱۴) قربانی کے جانور کا گوشت کھانا۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے قربانی کے جانور کی کلیجی کا گوشت تناول فرمایا ہے۔

(۱۵) ایامِ تشریق (۱۱، ۱۲، ۱۳ ذوالحجہ) کو تینوں جمرات پر جانا۔

(۱۶) ہر کنکری مارتے وقت اللہ اکبر کہنا اور یہ دعا مانگنا:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا مَبْرُوْرًا وَسَعْيًا مَشْكُوْرًا وَذَنْبًا مَغْفُوْرًا

''اے اللہ! اس حج کو مبرور بنا اور سعی کو قابل قدر بنا اور گناہ معاف فرما دے''۔

(۱۷) پہلے اور دوسرے (یعنی چھوٹے اور درمیانے) جمرہ کو کنکریاں مار کر قبلہ رو ہو کر دعا کرنا، اور تیسرے (بڑے) جمرہ کو کنکریاں مار کر دعا کے لیے نہ رکنا، کیونکہ اس کے پاس دعا کرنا مستحب نہیں۔ جناب رسول اللہ ﷺ اسے کنکریاں مار کر واپس لوٹ جاتے تھے۔

(۱۸) جمرہ عقبہ (بڑے جمرہ) کو رمی کرتے وقت وادی کے نشیب میں اس طرح کھڑے ہونا کہ سامنے جمرہ ہو جبکہ منیٰ دائیں طرف اور کعبہ شریف بائیں طرف۔

(۱۹) مکہ سے واپسی کے موقع پر یہ دعا پڑھنا:

((آيِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ ، صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهُ)) (۴۸)

''ہم واپس لوٹنے والے، توبہ کرنے والے، عبادت گزار، سجدہ کرنے والے اور اپنے ربّ کی تعریف کرنے والے ہیں۔ اللہ نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، اپنے بندہؐ کی مدد فرمائی اور اکیلے ہی نے (دشمنوں کی) تمام پارٹیوں کو شکست دے دی''۔

جناب رسول اللہ ﷺ مکہ سے واپسی کے موقع پر یہ دعا پڑھتے تھے۔

⑧ احصار (رکاوٹ)

جو شخص کسی دشمن، مرض یا کسی اور ایسی زبردست رکاوٹ کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں داخل نہ ہو سکے یا وقوفِ عرفات کے موقع پر حاضر نہ ہو سکے، اس کے لیے واجب ہے کہ جہاں سے رکاوٹ پیش آئی ہے وہیں ایک بکری، گائے یا اونٹ ذبح کر دے۔ یا اگر ممکن ہو تو کسی اور شخص کے ساتھ قربانی کا جانور حرم میں بھیج دے، اس کے بعد احرام کھول دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ (البقرۃ:۱۹۶)

''اور اگر تم روک لیے جاؤ تو جو قربانی میسر ہو (کر دو)۔''

⑨ طوافِ وَداع

حج کے تین طوافوں میں سے ایک طوافِ وَداع بھی ہے اور یہ طواف واجب ہے۔ جو بلا عذر اسے ترک کر دے اس پر دَم (قربانی دینا) لازم ہے، اور جو کسی عذر کی وجہ سے چھوڑے اس پر دَم نہیں ہے۔ حج یا عمرہ کرنے والا جب حج یا عمرہ سے فارغ ہو کر اور مکہ کی اقامت مکمل کر کے گھر جانے کا ارادہ کرے اس وقت یہ طواف ادا کرے۔ یعنی جب وہ مکہ مکرمہ سے باہر جانے کا ارادہ کرے تو سب سے آخری وقت یہ طواف کرے اور جب طواف کر لے تو فوراً مکہ سے نکل جائے۔ اگر وہ کسی مجبوری کے بغیر خرید و فروخت وغیرہ کے لیے رُک گیا تو روانگی کے وقت دوبارہ طواف کرے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَنْفِرَنَّ اَحَدٌ حَتّٰى يَكُوْنَ آخِرُ عَهْدِهٖ بِالْبَيْتِ))(۴۹)

''کوئی شخص ہرگز کوچ نہ کرے حتیٰ کہ اس کا آخری وقت کعبہ کے پاس گزرے۔''

⑩ حج اور عمرہ کے طریقہ کا تفصیلی بیان

حج اور عمرہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو شخص حج یا عمرہ کا احرام باندھنا چاہتا ہے وہ اپنے ناخن تراش لے، مونچھیں کاٹ لے، زیر ناف کے بال مونڈ لے، بغلوں کے بال اکھاڑ لے، پھر غسل کرے، اور دو صاف ستھری سفید چادریں پہن لے (ایک تہبند کی طرح باندھ لے دوسری اوڑھ لے) اور جوتے پہن لے۔ جب میقات پر پہنچے تو فرض یا نفل نماز ادا کرے، پھر اگر

Ma_2006\meesaq december06\minhaj42a.inp 8/20/2014 1:01 PM PAGE 3 (1,1)

صرف حج کا ارادہ رکھتا ہے تو لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ حَجًّا کہے حج کی نیت کر لے۔ اگر حج تمتع کا ارادہ ہے تو لَبَّیْکَ عُمْرَۃً کہے اور اگر حج قِران کرنا چاہتا ہے تو لَبَّیْکَ حَجًّا وَعُمْ کہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ مشروط احرام باندھے اور کہے: ((اِنَّ مَحِلِّیْ حَیْثُ حَبَسْتَنِیْ))[۵۰] (اے اللہ! جہاں تو مجھے روک لے گا میں وہیں احرام کھول دوں گا''۔ اس صورت میں اگر اسے کوئی ایسی رکاوٹ پیش آ جائے جس کی وجہ سے اس کے لیے حج یا عمرہ کے اعمال کو جاری رکھنا ممکن نہ رہے ـــــ مثلاً مرض وغیرہ ـــــ تو وہ احرام کھول دے گا اور اسے کوئی فدیہ وغیرہ ادا نہیں کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد مسلسل بلند آواز سے لبیک کہتا رہے۔ لیکن اتنی بلند آواز سے نہیں کہ مشقت کا باعث ہو۔ عورت کو لبیک پکارتے وقت آواز بلند نہیں کرنی چاہیے۔ وہ آواز صرف اتنی بلند کر سکتی ہے کہ ساتھ والی عورت سن لے۔

مستحب یہ ہے کہ جب بھی تلبیہ سے فارغ ہو تو دعا کرے اور درود شریف پڑھے۔ یہ بھی مستحب ہے کہ جب بھی کوئی نئی حالت پیش آئے ـــــ مثلاً سوار ہونا' سواری سے اُترنا' نماز' دوستوں سے ملاقات وغیرہ ـــــ تو نئے سرے سے لبیک پکارے۔ زبان کو اللہ کے ذکر کے علاوہ دوسری باتوں سے روک کر رکھے۔ آنکھ سے وہ چیز نہ دیکھے جسے دیکھنا شرعاً جائز نہیں۔ راستے میں اپنے ہم سفروں سے بھلائی اور احسان کا سلوک کرے۔ حاجت مندوں سے نیکی کرے' ہم سفروں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے' ان کے ساتھ نرمی سے بات کرے' انہیں سلام کہے' کھانا کھلائے اور اُمید رکھے کہ ان نیکیوں سے اسے ''حج مبرور'' کی سعادت حاصل ہو جائے گی۔

جب مکہ شریف پہنچ جائے تو مستحب ہے کہ داخلہ کے وقت غسل کرے۔ جب مکہ میں داخل ہونے لگے تو اوپر کی طرف والا راستہ اختیار کرے۔ جب مسجد حرام میں پہنچے تو باب بنی شیبہ یعنی باب السلام سے داخل ہو اور کہے: بِسْمِ اللّٰہِ وَبِاللّٰہِ اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ فَضْلِکَ ''اللہ کے نام سے اور اللہ کی توفیق سے (داخل ہو رہا ہوں) اے اللہ! میرے لیے اپنے فضل کے دروازے کھول دے''۔ جب بیت اللہ شریف پر نظر پڑے تو ہاتھ اٹھائے اور یہ الفاظ کہے:[۵۱]

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ ' فَحَیِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ' اَللّٰھُمَّ زِدْ ھٰذَا الْبَیْتَ تَشْرِیْفًا وَتَعْظِیْمًا وَتَکْرِیْمًا وَمَھَابَۃً وَبِرًّا' وَزِدْ مَنْ شَرَّفَہٗ وَکَرَّمَہٗ مِمَّنْ حَجَّہٗ اَوِ اعْتَمَرَہٗ تَشْرِیْفًا وَتَعْظِیْمًا وَتَکْرِیْمًا وَمَھَابَۃً وَبِرًّا ' اَلْحَمْدُ

لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ كَثِيْرًا كَمَا هُوَ اَهْلُهٗ وَكَمَا يَنْبَغِيْ لِكَرَمِ وَجْهِهٖ وَعِزِّ جَلَالِهٖ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بَلَّغَنِيْ بَيْتَهٗ وَرَآنِيْ لِذٰلِكَ اَهْلًا، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ، اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ دَعَوْتَ اِلٰى حَجِّ بَيْتِكَ الْحَرَامِ وَقَدْ جِئْتُكَ لِذٰلِكَ، اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّيْ وَاعْفُ عَنِّيْ وَاَصْلِحْ لِيْ شَاْنِيْ كُلَّهٗ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اَنْتَ

''اے اللہ! تو سلامتی والا ہے اور سلامتی تجھی سے ہے۔ اے ہمارے ربّ! ہمیں سلامتی کے ساتھ زندہ رکھ۔ اے اللہ! اس گھر کی عزت، عظمت، تکریم، ہیبت اور نیکی میں اضافہ فرما۔ اور حاجیوں یا عمرہ کرنے والوں میں سے جس نے اس گھر کی عزت اور تکریم کی تو اس کی عزت، عظمت، تکریم، ہیبت اور نیکی میں اضافہ فرما۔ اللہ ربّ العالمین کے لیے بہت سی تعریفیں ہیں جن کا وہ اہل ہے اور جیسے اس کی ذات کی شان اور جلال کے لائق ہے۔ اور اس اللہ کی تعریف ہے جس نے مجھے اپنے گھر تک پہنچایا اور مجھے اس لائق سمجھا۔ اور ہر حال میں اللہ کی تعریف ہے۔ اے اللہ! تو نے مجھے اپنے قابل احترام گھر کے حج کی طرف بلایا اور میں اسی مقصد کے لیے تیری خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ اے اللہ! مجھ سے (یہ عمل) قبول فرمالے اور مجھے معاف کردے اور میری حالت ہر طرح سے درست کردے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں''۔

اس کے بعد پاک صاف ہو کر کندھا ننگا کر کے طواف کی جگہ کی طرف آئے۔ پہلے حجرِ اسود کے پاس آئے، اسے بوسہ دے یا ہاتھ لگائے۔ اگر بوسہ دینا یا ہاتھ لگانا ممکن نہ ہو تو اس کی طرف اشارہ کرے۔ پھر حجرِ اسود کی طرف مُنہ کر کے کھڑا ہو جائے اور طواف کی نیت کرتے ہوئے کہے:

((بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ ، اَللّٰهُمَّ اِيْمَانًا بِكَ وَتَصْدِيْقًا بِكِتَابِكَ ، وَوَفَاءً بِعَهْدِكَ وَاتِّبَاعًا لِسُنَّةِ نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ ﷺ))

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ اے اللہ (میں طواف کرتا ہوں) تجھ پر ایمان لاتے ہوئے، تیری کتاب کی تصدیق کرتے ہوئے، تیرے وعدہ کو پورا کرتے ہوئے اور تیرے نبی حضرت محمد ﷺ کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے''۔

پھر طواف شروع کرے۔ طواف کے دوران کعبہ بائیں طرف رہے۔ اگر یہ طواف ''طوافِ قدوم'' ہے تو رمل بھی کرے۔ اس دوران ذکر، دعا اور درود میں مشغول رہے حتیٰ کہ رکن یمانی

کے برابر پہنچ جائے اور اسے ہاتھ لگائے۔ چکر اس قرآنی دعا پر ختم کرے: ﴿رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ ''اے ہمارے ربّ! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ''۔

پھر اسی طریقے سے دوسرا اور تیسرا چکر لگائے۔ جب چوتھا چکر شروع کرے تو رمل ختم کر دے اور عام طریقے سے چلتا رہے' حتیٰ کہ باقی چار چکر بھی پورے کر لے۔ طواف سے فارغ ہو کر ملتزم پر پہنچے اور وہاں بڑی عاجزی سے رو رو کر دعا مانگے۔ پھر مقامِ ابراہیم علیہ السلام پر آئے اور اس کے پیچھے دو رکعتیں پڑھے۔ ان میں سورۃ الفاتحہ کے بعد پہلی رکعت میں سورۃ ﴿قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ﴾ اور دوسری رکعت میں سورۃ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھے۔ اس نماز سے فارغ ہو کر زمزم پر آئے اور بیت اللہ کی طرف مُنہ کر کے زمزم کا پانی اتنا پیے کہ سیر ہو جائے۔ پیتے وقت جو چاہے دعا مانگے۔ اگر یہ دعا مانگے تو خوب ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَرِزْقًا وَاسِعًا وَشِفَاءً مِنْ کُلِّ دَاءٍ

''اے اللہ! میں تجھ سے فائدہ والا علم' کھلا رزق اور ہر مرض سے صحت کا سوال کرتا ہوں''۔

پھر حجرِ اسود کی طرف آئے' اسے بوسہ دے یا ہاتھ لگائے' پھر بابِ صفا کی طرف سے سعی کی جگہ کی طرف چلا جائے۔ اور یہ آیت پڑھے:

﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ:)

''بے شک صفا اور مروہ اللہ کی (عبادت کی) نشانیوں میں سے ہیں''۔

جب صفا پر پہنچے تو پہاڑی پر چڑھ جائے۔ پھر بیت اللہ کی طرف مُنہ کر کے تین بار اللہ اکبر کہے' پھر یہ دعا پڑھے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ' لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ' لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ

''اکیلے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اس کا کوئی شریک نہیں' حکومت اسی کی ہے اور تعریف اسی کی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ اکیلا ہے' اس نے اپنا وعدہ پورا کیا' اپنے بندے کی مدد فرمائی اور اس نے اکیلے ہی سب فوجوں کو شکست دے دی۔''

پھر دعا کرے اور دنیا و آخرت کی جو بھلائی چاہے مانگے۔ پھر مروہ کی طرف جانے کے لیے نیچے اترے۔ سعی کی جگہ میں اللہ کا ذکر کرتا اور دعائیں مانگتا چلا جائے۔ جب وادی کی اس نشیبی جگہ میں پہنچے جس کے تعین کے لیے اِس وقت سبز ستون بنے ہوئے ہیں، تو وہاں سے اسی طرح کے دوسرے سبز ستون پر بھاگ کر چلے۔ پھر آرام سے ذکر کرتا، دعائیں مانگتا اور درود پڑھتا چلا جائے حتیٰ کہ ''مروہ'' پر جا پہنچے۔ مروہ پر چڑھ کر اسی طرح اللہ اکبر کہے اور دعا پڑھے جس طرح ''صفا'' پر کیا تھا۔ پھر اتر کر وادی کی نشیبی جگہ تک چلتا آئے اور وہاں سے دوڑنا شروع کر دے۔ جب نشیبی جگہ سے نکل جائے تو پھر چلتے چلتے صفا تک پہنچ جائے، اس پر چڑھ کر بھی تکبیر، تہلیل اور دعا وغیرہ اسی طرح کرے جس طرح پہلی دفعہ کیا تھا۔ پھر اُتر کر مروہ کی طرف چل پڑے۔ اس طرح وہ سات چکر پورے کرے جس کے دوران وہ پہاڑیوں پر آٹھ دفعہ رُکے گا، چار دفعہ صفا پر اور چار دفعہ مروہ پر۔ اگر اس نے صرف عمرہ کی نیت کی تھی تو اس کے بعد اپنے بال کٹوا لے اور احرام کھول دے۔ اس کا عمرہ پورا ہو گیا۔ اسی طرح اگر اُس نے حج تمتّع کی نیت کی تھی تو بھی سعی سے فارغ ہو کر بال کٹواتے ہی اُس کا عمرہ پورا ہو گیا۔ لیکن اگر اُس نے حج اِفراد (اکیلے حج) کی نیت کی ہو یا وہ حج قِران (ایک ہی احرام سے حج اور عمرہ دونوں کی ادائیگی) کی نیت سے قربانی کا جانور ساتھ لایا ہو، تو اس کے لیے احرام کی حالت میں رہنا ضروری ہے۔ وہ احرام نہ کھولے حتیٰ کہ وہ عرفات میں ٹھہرنے کے بعد دس ذوالحجہ کو جمرۂ عقبہ پر رمی کر لے۔ اُس وقت وہ احرام کھول سکے گا۔ اگر اس نے حج قِران کی نیت کی تھی لیکن قربانی کا جانور ساتھ نہیں لایا تو اس کے لیے جائز ہے کہ حج کی نیت کو عمرہ کی نیت میں تبدیل کر کے عمرہ پورا ہوتے ہی احرام کھول دے۔ (۵۲)

اس کے بعد جب یومِ ترویہ یعنی آٹھ ذوالحجہ کا دن آ جائے تو حج کی نیت کرتے ہوئے اسی طرح احرام باندھے جس طریقے سے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ یہ حج تمتع والے کے لیے ہے۔ حج اِفراد اور حج قِران والے نیا احرام نہیں باندھیں گے، ان کا پہلا احرام ہی قائم رہے گا۔ اس دن (چاہے کسی بھی قسم کے حج کی نیت ہو) ضحیٰ کے وقت لبیک پکارتے ہوئے منیٰ کی طرف روانہ ہو۔ وہاں ایک دن رات قیام کرے اور پانچ نمازیں ادا کرے۔ عرفہ کے دن (نو ذوالحجہ کو) جب سورج طلوع ہو جائے تو منیٰ سے ضَبّ کے راستے سے نمرہ کی طرف چلے۔ سورج ڈھلتے تک وہاں رہے۔ پھر غسل کرے اور اس مسجد میں آئے جس میں اللہ کے رسول ﷺ نے نماز پڑھی تھی۔ اس میں امام کے ساتھ ظہر اور عصر کی نمازیں دو دو رکعت ظہر

کے وقت میں ادا کرے۔ نماز سے فارغ ہو کر میدانِ عرفات میں وقوف کے لیے چلا جائے۔ عرفات میں کسی بھی جگہ وقوف کیا جا سکتا ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

((قَدْ وَقَفْتُ هَاهُنَا وَ عَرَفَةُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ)) (۵۳)

''میں یہاں ٹھہرا ہوں اور پورا عرفات ٹھہرنے کی جگہ ہے۔''

اگر جبل رحمت کے نیچے چٹانوں کے پاس ٹھہرے جہاں جناب رسول اللہ ﷺ نے وقوف فرمایا تھا تو اچھی بات ہے۔ وقوف سواری پر بھی ہو سکتا ہے' کھڑے ہو کر بھی' بیٹھ کر بھی۔ یہاں شام تک ذکر اور دعا میں مشغول رہے۔ جب سورج غروب ہو چکے اور تھوڑی سی رات ہو جائے تو اطمینان و سکون سے لبیک کہتے ہوئے مزدلفہ کی طرف روانہ ہو۔ اس کے لیے ''مازمین'' کا راستہ اختیار کرے۔ مزدلفہ پہنچ کر اونٹ کا کجاوہ اتارنے سے پہلے مغرب کی نماز ادا کرے۔ پھر کجاوہ اتار کر عشاء کی نماز پڑھے۔ رات وہیں گزارے۔ جب صبح صادق طلوع ہو جائے تو فجر کی نماز پڑھے اور ''مشعر حرام'' کی طرف جائے اور اس کے پاس تکبیر و تہلیل اور دعا میں مشغول رہے۔ اس موقع پر پورے ''مزدلفہ'' میں کہیں بھی ٹھہرا جا سکتا ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

((قَدْ وَقَفْتُ هَاهُنَا وَمُزْدَلِفَةُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ)) (۵۴)

''میں یہاں ٹھہرا ہوں اور پورا مزدلفہ ٹھہرنے کی جگہ ہے۔''

جب صبح کی روشنی کافی زیادہ ہو جائے اور ابھی سورج طلوع نہ ہوا ہو تو جمرہ عقبہ (بڑے جمرہ) کو رمی کرنے کے لیے سات کنکریاں اٹھا لے اور لبیک پکارتا ہوا منیٰ کی طرف چل پڑے۔ جب ''وادیٔ محسر'' میں پہنچے تو تھوڑی دور جا کر سواری کو تیز کرے اور تیز چلے۔ جب منیٰ پہنچے تو سیدھا جمرہ عقبہ پر پہنچے اور اسے سات کنکریاں مارے۔ کنکری مارتے وقت اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہے۔ اس کے لیے یہ بھی کہہ سکتا ہے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا مَّبْرُوْرًا وَسَعْيًا مَشْكُوْرًا وَذَنْبًا مَغْفُوْرًا (۵۴)

''اے اللہ! اسے مقبول حج بنا اور سعی کو قابل قدر بنا اور گناہ معاف فرما۔''

اس کے بعد اگر اس کے پاس قربانی کا جانور ہو تو اسے ذبح کرے۔ اگر خود ذبح نہ کر سکتا ہو تو کسی کو جانور ذبح کرنے کے لیے مقرر کرے۔ منیٰ میں کسی بھی مقام پر جانور ذبح کیا جا سکتا ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

((نَحَرْتُ هَاهُنَا وَمِنًى كُلُّهَا مَنْحَرٌ)) (۵۵)

''میں نے یہاں قربانی کی ہے اور پورے کا پورا منیٰ قربانی کی جگہ ہے''۔
پھر سر منڈائے یا بال چھوٹے کروالے اور سر منڈانا افضل ہے۔ اب اس کا احرام کھل گیا۔ اسے ''حل اصغر'' کہتے ہیں' احرام کی وجہ سے جو پابندیاں لگی تھیں وہ سب اٹھ گئیں۔ صرف عمل زوجیت کی پابندی باقی رہ گئی۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِذَا رَمٰی اَحَدُکُمْ جَمْرَةَ الْعَقَبَةِ فَقَدْ حَلَّ لَهٗ کُلُّ شَیْءٍ اِلَّا النِّسَاءَ))(۵۶)

''جب کوئی شخص جمرہ عقبہ کو رمی کرلے تو اس کے لیے عورتوں کے سوا سب کچھ حلال ہو جاتا ہے''۔

اب وہ سر ڈھانپ سکتا ہے اور سلے ہوئے کپڑے پہن سکتا ہے۔ پھر اگر ہو سکے تو (اسی دن) طوافِ افاضہ کے لیے مکہ جائے۔ یہ طواف حج کے چار ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ وہ مسجد میں باوضو داخل ہو اور جس طرح طوافِ قدوم کیا تھا اسی طریقے سے طواف کرے' لیکن کندھا ننگا نہ کرے اور رَمل بھی نہ کرے' یعنی پہلے تین چکروں میں تیزی سے نہ چلے۔ جب سات چکر پورے ہو جائیں تو مقام ابراہیمؑ کے پیچھے دو رکعت نماز ادا کرے۔ پھر اگر تو اس نے حج اِفراد یا حج قِران کیا ہے اور طوافِ قدوم کے وقت سعی کی ہے تو وہی سعی کافی ہے' اب طوافِ افاضہ کے ساتھ سعی کرنے کی ضرورت نہیں' لیکن اگر اس کا حج تمتع ہے تو طواف کے بعد صفا مروہ کے درمیان مذکورہ بالا طریقے سے سعی بھی کرے۔ سعی مکمل کرتے ہی وہ مکمل طور پر حلال ہو گیا اور احرام کی وجہ سے جو پابندیاں اس پر عائد ہوئی تھیں وہ سب کی سب ختم ہو گئیں۔ پھر اسے چاہیے کہ اسی دن منیٰ میں واپس چلا جائے اور رات وہاں گزارے۔ جب ایامِ تشریق کے پہلے دن (گیارہ ذوالحجہ کو) سورج ڈھل جائے تو رمی کے لیے جمرات پر جائے۔ پہلے چھوٹے جمرہ کو — جو مسجد خیف سے قریب ہے — یکے بعد دیگرے سات کنکریاں مارے۔ ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہے۔ کنکریاں مارنے کے بعد تھوڑا سا ایک طرف ہو کر قبلہ رُخ ہو کر دعا مانگے۔ پھر درمیانہ جمرہ پر جا کر اسی طریقے سے کنکریاں مارے اور تھوڑا سا ایک طرف ہٹ کر قبلہ کی طرف مُنہ کرے اور دعا مانگے۔ پھر بڑے جمرہ کی طرف جائے اور اسے بھی سات کنکریاں مارے۔ ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہے۔ اور اس کے بعد دعا نہ مانگے' کیونکہ نبی ﷺ نے اس کے بعد دعا نہیں کی' اور واپس چلا جائے۔ دوسرے دن (بارہ ذوالحجہ کو) جب سورج ڈھل جائے پھر آ کر تینوں جمرات پر حسب سابق رمی کرے۔ (۵۷) پھر اگر جلدی کرنا چاہے تو اسی دن سورج غروب ہونے سے پہلے مکہ چلا جائے ورنہ رات منیٰ میں

گزارے۔اور تیسرے دن (تیرہ ذوالحجہ کو) سورج ڈھلنے کے بعد حسب سابق تینوں جمرات کو رمی کرے' پھر مکہ چلا جائے۔جب مکہ سے واپس جانے کا ارادہ ہو تو طوافِ وَداع کرے۔یعنی کعبہ کے گرد سات چکر لگائے' اس کے بعد مقامِ ابراہیمؑ کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھے اور یہ کہتا ہوا واپس ہو جائے:

((لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْکَ لَهٗ ' لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ. آيِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ ' لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ))

''اکیلے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ لاشریک ہے' بادشاہی اسی کی ہے' تعریف بھی اسی کی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ہم واپس ہونے والے ہیں' توبہ کرنے والے ہیں' عبادت گزار ہیں' سجدہ کرنے والے ہیں اور اپنے ربّ کی تعریف کرنے والے ہیں۔اکیلے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا' اپنے بندے کی مدد کی اور اکیلے نے تمام لشکروں کو شکست دی''۔

حواشی

(٤٢) مسند احمد۔ وجامع الترمذی' کتاب الحج عن رسول اللہ ﷺ ' باب ما جاء فی من ادرك الامام بجمع فقد ادرك الحج۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

(٤٣) صحیح مسلم' کتاب الحج' باب استحباب رمی جمرة العقبة یوم النحر راکبا..... الخ۔

(٤٤) دستیاب کتب میں اس حدیث کا حوالہ نہیں مل سکا۔

(٤٥) جامع الترمذی' کتاب الحج عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی الوقوف بعرفات والدعاء بها۔ امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔

(٤٦) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب مر النبی ﷺ بالسکینة عند الافاضة واشارته الیهم بالسوط۔

(٤٧) یہ تمام آداب صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ان میں سے ہر مسئلہ کے لیے جناب رسول اللہ ﷺ کے ارشاد یا عمل کی صورت میں دلیل موجود ہے۔

(٤٨) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب ما یقول اذا رجع من الحج او العمرة او الغزو۔وصحیح مسلم' کتاب الحج' باب ما یقول اذا قفل من سفر الحج وغیره۔

(٤٩) صحیح مسلم' کتاب الحج' باب وجوب طواف الوداع وسقوطه عن الحائض۔

(۵۰) حضرت ضباعہ بنت زبیر رضی اللہ عنہا بیمار تھیں۔ انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''حج کرو اور شرط لگا لو کہ میں وہاں احرام کھول دوں گی جہاں (اے اللہ) تو مجھے روک لے''۔ (صحیح مسلم، کتاب الحج، باب جواز اشتراط المحرم التحلل بعذر المرض ونحوہ)۔

(۵۱) السنن الکبریٰ للبیہقی (۷۳/۵) ودیگر کتب احادیث۔

(۵۲) حجۃ الوداع کے موقعہ پر صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اسی طرح کیا تھا، کہ جن کے پاس قربانی کے جانور نہیں تھے انہوں نے احرام کھول دیا تھا۔

(۵۳) سنن ابی داؤد، کتاب المناسك، باب صفة حجة النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

(٥٤) مسند احمد، کتاب مسند المکثرین من الصحابة، باب مسند عبداللہ بن مسعود۔ مسند احمد کی روایت میں "وَسَعْيًا مَشْكُوْرًا" کے الفاظ نہیں ہیں۔ دعا کے مکمل الفاظ ابن رجب نے لطائف المعارف (ص ۱۲۵) میں عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالے سے نقل کیے ہیں۔ اسی طرح ابن الملقن نے البدر المنیر (۲۱۲/٦) میں اور ابن حجر نے تلخیص الحبیر (۸۷۷/۳) میں مکمل الفاظ روایت کیے ہیں۔

(۵۵) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب ما جاء ان عرفة کلها موقف۔

(٥٦) سنن ابی داؤد، کتاب المناسك، باب فی رمی الجمار۔

(۵۷) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا اور ہمارے ساتھ عورتیں اور بچے بھی تھے۔ ہم نے بچوں کی طرف سے لبیک کہا اور ان کی طرف سے رمی کی'' (سنن ابن ماجہ، کتاب المناسك، باب الرمی عن الصبیان) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچوں، بیماروں اور کمزوروں کی طرف سے رمی کی جا سکتی ہے۔

مُحرّمات (۸)

(حرام اُمور، جن سے بچنا ضروری ہے)

حافظ محمد زبیر

(۶۲) موسیقی اور آلاتِ موسیقی کا سننا

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ق﴾(لقمٰن:٦)

''اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کھیل تماشے کی باتیں خریدتے ہیں تاکہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے بغیر علم کے گمراہ کر دیں''۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

الغناء واللّٰه الذی لا اله الّا هو ' یرددها ثلاث مرات (۱)

''اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں! اس سے مراد ''گانا'' ہے۔ آپؓ نے اس بات کو تین مرتبہ دہرایا''۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت جابر رضی اللہ عنہ، حضرت عکرمہ، حضرت سعید بن جبیر، حضرت مجاہد رحمہم اللہ وغیرہم نے بھی اس آیت مبارکہ کی یہی تفسیر کی ہے۔ جس طرح ''غنا'' یعنی گانے کو حرام کیا گیا ہے۔ اسی طرح آلاتِ موسیقی کی حرمت کے دلائل بھی احادیث میں کثرت سے ملتے ہیں۔ حضرت ابو عامرؓ یا ابو مالک الاشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَيَكُوْنَنَّ مِنْ اُمَّتِيْ اَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّوْنَ الْحِرَ وَالْحَرِيْرَ وَالْخَمْرَ وَالْمَعَازِفَ))(۲)

''میری اُمت میں ایسے لوگ بھی لازماً آئیں گے جو زنا، ریشم، شراب اور آلاتِ موسیقی کو حلال قرار دیں گے''۔

شادی بیاہ اور عید کے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے بچیوں کو دف بجانے کی اجازت دی۔ اس لیے علماء نے دف کو جائز قرار دیا ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر گھر کی بچیاں اگر دلہا یا دلہن کی تعریف میں کوئی گیت گا لیں تو اس کی اجازت ہے، بشرطیکہ اس کے مواد میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو شرعی تعلیمات کے منافی ہو۔ دف کی بجائے دیگر آلاتِ موسیقی مثلاً بانسری، گٹار، پیانو، ڈھول اور بینڈ باجے وغیرہ ممنوع اور حرام ہیں۔ ان آلاتِ موسیقی اور گانے بجانے کا کسی معاشرے میں عام ہو جانا اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((فِيْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ خَسْفٌ وَمَسْخٌ وَقَذْفٌ)) فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَتٰى ذَالِكَ؟ قَالَ :((اِذَا ظَهَرَتِ الْقَيْنَاتُ وَالْمَعَازِفُ وَشُرِبَتِ الْخُمُوْرُ))(۳)

''اس اُمت میں زمین میں دھنسائے جانے، چہروں کو مسخ کرنے اور آسمانوں سے پتھروں کی بارش کا عذاب ہوگا۔'' مسلمانوں میں سے ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ کب ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: ''جب گانے بجانے والیاں اور آلاتِ موسیقی عام ہو جائیں گے اور شرابیں پی جائیں گی''۔

بعض مسلم سکالرز نے ان صریح روایات کی تاویل کرتے ہوئے موسیقی کو جائز قرار دیا ہے۔ ان میں ایک تو عالمِ عرب کے معروف عالم دین ڈاکٹر یوسف القرضاوی اور دوسرے پاکستان میں روشن خیال اسلام کے علمبردار جناب جاوید احمد غامدی ہیں۔ مقدم الذکر کے موقف کا مدلل اور پُرزور جواب عالمِ عرب ہی کے مایۂ ناز محدث علامہ ناصر الدین البانی مرحوم نے اپنی کتاب ''آلات الطرب'' میں دیا ہے، جبکہ مؤخر الذکر کا جواب مولانا مبشر احمد لاہوری صاحب نے اپنی کتاب ''موسیقی حرام نہیں؟'' میں دیا ہے۔ علاوہ ازیں شیخ الحدیث ارشاد الحق اثری صاحب نے بھی غامدی صاحب کے موسیقی کے بارے میں موقف کا ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں بھرپور علمی اور تحقیقی انداز میں تعاقب کیا جو کہ اب کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

(۶۳) عورتوں کا تنگ اور باریک لباس پہننا

عصر حاضر کے فتنوں میں ایک بڑا فتنہ حیا باختہ عورتوں کا بھی ہے کہ جن کا لباس مغربی عورت کی تقلید میں دن بدن گھٹتا ہی جا رہا ہے۔ شروع میں برقع اترا' پھر دوپٹا بھی گیا اور چہرے کے ساتھ ساتھ سر اور گردن بھی ننگی ہوئی۔ بڑے گلوں کا رواج آیا تو سینے کا ایک حصہ بھی نمایاں ہو کر سامنے آ گیا۔ اب تو ''پٹیالہ'' شلوار قمیص نے رہی سہی کسر بھی نکال دی ہے۔ آئے دن عورتوں کی قمیصیں چھوٹی سے چھوٹی اور تنگ سے تنگ ہوتی جا رہی ہیں' جس کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد ہے کہ عورت نے اپنے جسم کے جن اعضاء کو معاشرتی قدغنوں کی وجہ سے چھپایا ہوا ہے وہ بھی کسی طرح تنگ اور باریک کپڑے پہننے سے نمایاں ہو کر سامنے آ جائیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ایسی عورتوں کو جہنم کی بشارت دی ہے جو لباس پہن کر بھی ننگی رہتی ہیں' یعنی یا تو اتنا باریک لباس پہنتی ہیں کہ سارا جسم اس میں سے نظر آ رہا ہوتا ہے' جیسے کہ ایسی عورتوں کے گرمیوں میں لان وغیرہ کے کپڑے ہوتے ہیں' یا پھر اتنا تنگ لباس پہنتی ہیں کہ جسم کے نشیب و فراز واضح ہو رہے ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((صِنْفَانِ مِنْ اَهْلِ النَّارِ لَمْ اَرَهُمَا :قَوْمٌ مَعَهُمْ سِيَاطٌ كَاَذْنَابِ الْبَقَرِ يَضْرِبُوْنَ بِهَا النَّاسَ وَنِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مُمِيلَاتٌ مَائِلَاتٌ رُءُ وْسُهُنَّ كَاَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ لَا يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يَجِدْنَ رِيْحَهَا وَاِنَّ رِيْحَهَا لَيُوْجَدُ مِنْ مَسِيْرَةِ كَذَا وَكَذَا))(۴)

''دو گروہ ایسے ہیں جو اہل جہنم میں سے ہیں' لیکن میں نے ان کو نہیں دیکھا (یعنی میری وفات کے بعد آئیں گے): ایک تو وہ لوگ ہوں گے جن کے پاس گائے کی دُموں جیسے کوڑے ہوں گے جن کے ساتھ یہ لوگوں کو ماریں گے اور دوسری وہ عورتیں ہوں گی جو کپڑے پہن کر بھی ننگی ہوں گی (یعنی یا تو باریک لباس پہنا ہوگا جس کی وجہ سے جسم نظر آ رہا ہوگا یا پھر ایسا لباس پہنا ہوگا کہ جس نے اُن کے جسم کا کچھ حصہ ڈھانپا ہوگا اور کچھ حصہ ننگا ہوگا)' مَردوں کو اپنی طرف مائل کرنے والی اور خود مَردوں کی طرف مائل ہونے والی ہوں گی۔ اُن کے سر ایسے ہوں گے جیسے کہ خراسانی نسل کے اونٹ کے کوہان ہوں (سر کے بالوں کے نت نئے فیشن اور سٹائلز کی طرف اشارہ ہے)۔ یہ عورتیں نہ تو جنت میں داخل ہوں گی اور نہ ہی اس کی خوشبو پا سکیں گی' حالانکہ جنت کی خوشبو اتنے اتنے فاصلے سے محسوس ہوگی''۔

''مَائِلَاتٌ مُمِيلَاتٌ'' کی شرح میں بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو کہ خوشبو لگا کر گھر سے باہر نکلتی ہیں اور اپنے کندھوں یا جسم کو مٹکا مٹکا کر چلتی ہیں تاکہ مَردوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں۔

(۶۴) کسی دوسرے کے بال لے کر اپنے بالوں میں ملانا

جس طرح عورتوں کے لیے اپنے بالوں کو جڑ سے مونڈنا حرام ہے اسی طرح ان کے لیے اپنے بالوں میں اضافہ کرنا بھی حرام ہے۔ اب عورتوں کے علاوہ مرد بھی اس بیماری میں مبتلا ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ایسے افراد پر لعنت فرمائی ہے جو کہ کسی دوسرے کے بال مستعار لے کر اپنے سر پر لگائیں' چاہے یہ کسی ضرورت کے تحت ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ انصار میں سے ایک لڑکی کی شادی ہوئی۔ بیماری کی وجہ سے اس کے سر کے بال جھڑ گئے تھے' تو اس کے گھر والوں نے چاہا کہ کسی طرح اس کے سر پر کسی اور کے بال لگا دیں۔ انہوں نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاصِلَةَ وَالْمُسْتَوْصِلَةَ))(۵)

''اللہ تعالیٰ بال لگانے والی اور لگوانے والی پر لعنت فرمائے''۔

اگر کسی کے سر پر بال نہیں ہیں تو بال اُگانے کے لیے تو کسی علاج کی گنجائش نکلتی ہے' لیکن مصنوعی بالوں کے ذریعے اس عیب کو دُور کرنا اس حدیث کی رو سے کسی بھی طرح جائز نظر نہیں آتا۔

(۶۵) جاندار اشیاء کی تصویر بنانا

شریعت نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں سے ایک جاندار اشیاء کی تصویر بھی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

((اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْمُصَوِّرُوْنَ))(۶)

''بے شک قیامت کے دن لوگوں میں سے سخت ترین عذاب تصویریں بنانے والوں کو دیا جائے گا۔''

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو دیکھیں اور اپنے تعلیمی نظام پر ذرا غور کریں جہاں بچوں کو نرسری اور پریپ سے ہی ڈرائنگ کے نام پر تصاویر بنانا سکھایا جاتا ہے۔ یہ ایک بالکل غیر اسلامی اور غیر شرعی فعل ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ میں یہ تصویریں بناتا ہوں' آپؓ مجھے اس کے بارے میں فتویٰ دیں' تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے کہا میرے قریب ہو جاؤ۔ وہ آپؓ کے قریب ہو گیا' آپؓ نے فرمایا اور قریب ہو جاؤ تو وہ اور زیادہ قریب ہو گیا' تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((كُلُّ مُصَوِّرٍ فِي النَّارِ))(۷)

''ہر تصویر بنانے والے کو جہنم میں ڈالا جائے گا۔''

ایک اور روایت میں الفاظ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كُلُّ مُصَوِّرٍ فِي النَّارِ يُجْعَلُ لَهٗ بِكُلِّ صُوْرَةٍ صَوَّرَهَا نَفْسٌ تُعَذِّبُهٗ فِيْ جَهَنَّمَ)) فَاِنْ كُنْتَ لَا بُدَّ فَاعِلًا فَاجْعَلِ الشَّجَرَ وَمَا لَا نَفْسَ لَهٗ (۸)

''ہر تصویر بنانے والا جہنم میں جائے گا' اس کی ہر تصویر کے بدلے میں جو اس نے بنائی ہو گی' ایک جان پیدا کی جائے گی جو اس کو جہنم میں عذاب دے گی''۔ (پھر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس شخص سے فرمایا) اگر تم نے لازماً تصویریں بنانی ہی ہیں تو درخت اور ایسی چیزوں کی تصویر بناؤ جن میں روح نہ ہو''۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بے جان چیزوں مثلاً درخت' پتھر وغیرہ کی تصویریں بنانا جائز ہے۔ بعض روایات میں تصویر سازی کو شرک کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذَهَبَ يَخْلُقُ كَخَلْقِيْ فَلْيَخْلُقُوْا حَبَّةً وَلْيَخْلُقُوْا ذَرَّةً))(۹)

''اور اس سے بڑا ظالم کون ہو گا جو کہ میری مخلوق جیسی مخلوق بنانے کی کوشش کرتا ہے؟ پس انہیں چاہیے کہ وہ ایک دانہ یا ایک ذرہ تو پیدا کر کے دکھائیں!''

بعض علمائے عرب نے اس جیسی روایات کی وجہ سے کیمرے کی تصویر کو جائز قرار دیا ہے۔ اُن کے نزدیک ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویر تو انسان کی ذہنی تخلیق ہے' لیکن کیمرے کی بنائی ہوئی تصویر تو اللہ ہی کی تخلیق کا ایک عکس ہے جو ایک مشین کے ذریعے کاغذ پر اتار لیا گیا ہو۔ لیکن برصغیر پاک و ہند کے علماء ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویر کے ساتھ ساتھ کیمرے کی تصویر کو بھی ناجائز قرار دیتے ہیں' سوائے اس کے کہ کوئی مجبوری ہو' مثلاً شناختی کارڈ یا پاسپورٹ بنوانے کے لیے تصویر بنوانا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کیمرے کی تصویر کو انسانی تخلیق نہیں کہا جا سکتا' لیکن فی زمانہ یہ تصویر عریانی اور فحاشی کا ایک بہت بڑا ذریعہ اور سبب ہے' اس لیے اگر اسے شرعاً حرام نہ بھی قرار دیا جائے تو پھر بھی یہ سدًّا لِلذّریعة ضرور حرام ہو گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ وَلَا صُوْرَةٌ))(۱۰)

''فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کوئی کتا یا تصویر ہو''۔

مغرب سے درآمد شدہ فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ بھی ہے کہ گھریلو استعمال کی اشیاء' عورتوں کے میک اپ کا سامان' بچوں کے گارمنٹس' اخبارات' رسائل اور کتب وغیرہ کو تصاویر سے مزین کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کوشش یہی کرنی چاہیے کہ ایسی تصاویر کو مقامِ عزت پر نہ رکھا جائے' اور نہ ہی یہ دورانِ نماز نمازی کے سامنے ہوں۔

(۶۶) قبر پر بیٹھنا

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے فرامین مبارکہ میں قبر پر بیٹھنے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَاَنْ يَّجْلِسَ اَحَدُكُمْ عَلٰى جَمْرَةٍ فَتُحْرِقَ ثِيَابَهٗ فَتَخْلُصَ اِلٰى جِلْدِهٖ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ يَّجْلِسَ عَلٰى قَبْرٍ))(۱۱)

''تم میں سے کوئی کسی آگ کے انگارے پر بیٹھے تو وہ اس کے کپڑوں کو جلا دے اور اس کی جلد تک پہنچ جائے' یہ زیادہ بہتر ہے اس سے کہ وہ کسی قبر پر بیٹھے''۔

امام نووی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

وفی هذا الحديث كراهة تجصيص القبر والبناء عليه وتحريم القعود والمراد بالقعود الجلوس عليه۔ هذا مذهب الشافعي وجمهور العلماء (۱۲)

''یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ قبروں کو پختہ کرنا اور ان پر عمارت تعمیر کرنا مکروہ ہے اور قبروں پر بیٹھنا حرام ہے۔ یہ امام شافعیؒ کا موقف ہے اور جمہور علماء کی بھی یہی رائے ہے''۔

(۶۷) نوحہ کرنا

اسلامی معاشروں میں مروّج منکرات میں سے ایک منکر کسی رشتہ دار کی وفات پر چیخ و پکار کرنا' میت کو دہائیاں دینا' چہرے اور سینے کو پیٹنا اور گریبان پھاڑنا بھی ہے۔ عام طور پر عورتیں زیادہ بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان افعالِ قبیحہ کی مرتکب ہوتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَطَمَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ))(۱۳)

''اس شخص کا ہم (یعنی ہمارے دین) سے کوئی تعلق نہیں جس نے اپنے رخساروں کو پیٹا' گریبان کو پھاڑا اور دورِ جاہلیت جیسا واویلا کیا''۔

بعض روایات میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایسی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو کسی قریبی عزیز کی وفات پر اپنا چہرہ نوچیں یا گریبان پھاڑیں۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَعَنَ الْخَامِشَةَ وَجْهَهَا وَالشَّاقَّةَ جَيْبَهَا))(۱۴)

''اللہ تعالیٰ اس عورت پر لعنت کرے جو اپنا چہرہ نوچتی ہے اور اپنا گریبان پھاڑتی ہے!''

اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلنَّائِحَةُ اِذَا لَمْ تَتُبْ قَبْلَ مَوْتِهَا تُقَامُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِّنْ قَطِرَانٍ وَدِرْعٌ مِنْ جَرَبٍ))(۱۵)

''نوحہ کرنے والی اگر اپنی موت سے پہلے توبہ نہ کرے گی تو قیامت کے دن اس کو کھڑا کیا جائے گا اور اس کو گندھک کے تیزاب کا کُرتہ اور خارش کی چادر پہنائی جائے گی''

(۶۸) مسلمان بھائی کو تین دن سے زیادہ بلا کسی شرعی سبب کے چھوڑ دینا

اپنے کسی مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ ناراضگی اختیار کرنا اور قطع کلامی کرنا حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ اَنْ يَّهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ يَلْتَقِيَانِ فَيُعْرِضُ هٰذَا وَ يُعْرِضُ هٰذَا وَخَيْرُهُمَا الَّذِىْ يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ))(۱۶)

''کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو تین راتوں (یعنی تین ایام) سے زیادہ چھوڑے رکھے' اس حال میں کہ جب وہ دونوں آپس میں ملیں تو ہر ایک دوسرے سے اعراض کرے' اور ان دونوں میں سے بہتر وہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے''۔

کسی مسلمان بھائی سے وقتی ناراضگی تو کیا آج ہم میں سے اکثر و بیشتر کی حالت یہ ہے کہ اپنے حقیقی بھائیوں سے سالہا سال تک ناراضگیاں چلتی رہتی ہیں۔ یہ باہمی رنجشیں اور کدورتیں انسان کی دنیا تو خراب کرتی ہی ہیں اس کے ساتھ ساتھ انسان کی آخرت بھی تباہ کر دیتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((تُعْرَضُ اَعْمَالُ النَّاسِ كُلَّ جُمُعَةٍ مَرَّتَيْنِ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَيَوْمَ الْخَمِيْسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّؤْمِنٍ اِلَّا عَبْدًا كَانَتْ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ اتْرُكُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَفِيْئَا))(۱۷)

''ہر ہفتے لوگوں کے اعمال دو بار' سوموار اور جمعرات' اللہ کے حضور پیش کیے جاتے ہیں' پس ہر بندۂ مؤمن کی مغفرت کی جاتی ہے سوائے اس بندۂ مؤمن کے کہ جس کے اور اس کے بھائی کے درمیان کوئی کینہ اور عداوت ہو۔ پس (فرشتوں سے) کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کو (ان کے حال پر) چھوڑے رکھو یہاں تک کہ وہ لوٹ آئیں (یعنی آپس میں راضی ہو جائیں)''۔

(۶۹) نرد کھیلنا

نرد، چوسر سے ملتا جلتا ایک کھیل ہے جو کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایرانیوں میں بہت معروف تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں اس کے کھیلنے کی بھی ممانعت آئی ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ لَعِبَ بِالنَّرْدَ شِيْرِ فَكَانَّمَا صَبَغَ يَدَهُ فِيْ لَحْمِ خِنْزِيْرٍ وَدَمِهِ))(۱۸)

''جس نے نرد شیر کھیلا اس نے گویا اپنے ہاتھ کو خنزیر کے گوشت اور خون میں رنگ لیا۔''

اسی حدیث کی بنیاد پر جمہور علماء نے ''نرد'' کو حرام قرار دیا ہے۔ شطرنج بھی اسی قسم کا ایک کھیل ہے، لیکن اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

واما الشطرنج فمذهبنا انه مكروه ليس بحرام وهو مروى عن جماعة من التابعين وقال مالك و احمد :حرام ' قال مالك :هوشر من النرد و الهى عن الخير وقاسوه على النرد(۱۹)

''جہاں تک شطرنج کا معاملہ ہے تو ہمارا (یعنی شوافع) کا مذہب یہ ہے کہ شطرنج کھیلنا حرام نہیں بلکہ مکروہ ہے، اور تابعین کی ایک جماعت کا بھی یہی موقف ہے، جبکہ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کا کہنا ہے کہ شطرنج کھیلنا حرام ہے۔ امام مالک نے یہ بھی کہا ہے کہ شطرنج تو نرد سے بھی زیادہ برا کھیل ہے اور نیکی کے کاموں سے غافل کرنے والا ہے۔ ان ائمہ نے شطرنج کو نرد پر قیاس کیا ہے''۔

اس حدیث کی رو سے ہر ایسا کھیل کہ جس میں نہ دین کا فائدہ ہو نہ دنیا کا، مکروہ اور حرام قرار پائے گا۔ احادیث میں اپنے بچوں کو تین قسم کے کھیل سکھلانے کی تاکید کی گئی ہے، ایک تیراکی، دوسرا گھڑ سواری اور تیسرا تیر اندازی۔ والدین کو چاہیے کہ بچوں کی تربیت میں ان چیزوں کا خاص خیال رکھیں۔ بعض کھیل تو ایسے ہیں کہ جن میں انسان کو آخرت کا نہ سہی دنیا کا کچھ نہ کچھ فائدہ ہو جاتا ہے، مثلاً اس کے جسم کی ورزش ہو جاتی ہے یا وہ اس کی صحت کے لیے مفید ہوتے ہیں۔ لیکن بعض کھیل جو کہ ہمارے ہاں بہت عام ہیں، مثلاً تاش، ویڈیو گیمز اور لڈّو وغیرہ، ان کا کچھ فائدہ نہیں ہے سوائے وقت کے ضیاع کے۔

حواشی

۱) تفسیر ابن کثیر، سورۃ لقمٰن : ٦

۲) صحیح البخاری، کتاب الاشربۃ، باب ما جاء فیمن یستحل الخمر ویسمیه بغیر اسمه۔

۳) سنن الترمذی، کتاب الفتن عن رسول اللهﷺ، باب ما جاء فی علامة حلول المسخ والخسف۔

۴) صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینة، باب النساء الکاسیات العاریات المائلات الممیلات۔

۵) صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب الوصل فی الشعر۔

٦) صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب عذاب المصورین یوم القیامة۔

۷) صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینة، باب تحریم تصویر صورة الحیوان وتحریم اتخاذ مافیه۔

۸) مسند احمد:۲٦۷۱۔

۹) صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب نقض الصور۔

۱۰) صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق ، باب اذا وقع الذباب فی شراب احدکم فلیغمسه فان فی احدی جناحیه داءً وفی الاخری شفاءً ۔

۱۱) صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب النهی عن الجلوس علی القبر والصلاة علیه ۔

۱۲) شرح النووی علی الصحیح المسلم، کتاب الجنائز، باب النهی عن الجلوس علی القبر والصلاة علیه۔

۱۳) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب لیس منا من شق الجیوب۔

۱۴) سنن ابن ماجه، کتاب ما جاء فی الجنائز، باب ما جاء فی النهی عن ضرب الخدود وشق الجیوب۔

۱۵) صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب التشدید فی النیاحة۔

۱٦) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب الهجرة۔

۱۷) موطا امام مالك، کتاب الجامع، باب ما جاء فی المهاجرة۔

۱۸) صحیح مسلم، کتاب الشعر، باب تحریم اللعب بالنردشیر۔

۱۹) شرح النووی علی الصحیح المسلم، کتاب الشعر، باب تحریم اللعب بالنردشیر۔

❁ ❁ ❁

امام یزید بن ہارونؒ

۱۱۸ھ — ۲۰۶ھ

عبدالرشید عراقی

دوسری صدی ہجری میں تبع تابعین کے گروہ میں جن علمائے اسلام نے کتاب وسنت کی اشاعت اور اس کی ترقی وترویج میں نمایاں کارنامے انجام دیے ان میں امامِ حدیث حافظ یزید بن ہارون رحمۃ اللہ علیہ ایک ممتاز مقام کے حامل تھے۔ آپؒ ایک بلند مرتبہ امام حدیث، سیرت و کردار کے لحاظ سے اعلیٰ، تقویٰ وطہارت میں بے مثال، زہد وورع کا مجسمہ، علم وعمل کا پیکر اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد اور مشن ہی امر بالمعروف ونہی عن المنکر تھا۔(۱)

علم وفضل میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا اور اس کے ساتھ عبادت وریاضت کی صفات ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ نماز بڑے خشوع وخضوع سے ادا کرتے تھے۔ خشیتِ الٰہی سے ہر وقت لرزتے رہتے تھے۔ خشیتِ الٰہی کا ان پر اس قدر غلبہ تھا کہ ان کی آنکھیں ہر وقت پُرنم رہتی تھیں، جس کی وجہ سے آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ ایک شخص نے آپؒ سے بینائی سے محروم ہونے کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا:

ذهب بهما بكاء الاسحار(۲)

''گریۂ صبح گاہی نے میری دونوں آنکھیں لے لیں''۔

ولادت

امام یزید بن ہارونؒ ۱۱۸ھ میں واسط (عراق) میں پیدا ہوئے۔ ان کی کنیت ابوخالد تھی۔ بنواسلم کے غلام ہونے کی وجہ سے اسلمی کہلاتے تھے۔(۳)

تعلیم وتربیت

امام یزید بن ہارونؒ نے اپنی تعلیم کا آغاز اپنے وطن واسط سے کیا، اور اُس دَور کے

واسط میں مقیم اساطینِ فن سے اکتسابِ فیض کیا۔لیکن امام یزید واسط میں جس طرح علم حاصل کرنا چاہتے تھے اس میں انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ چنانچہ امام یزید بن ہارونؒ نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے واسط کو خیر باد کہا۔حافظ ذہبی ''تذکرۃ المناظر'' میں لکھتے ہیں کہ:''امام یزید بن ہارون واسط سے باہر جانے کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ حاسدین کی وجہ سے واسط میں رہ کر علم وفضل میں امتیاز حاصل کرنا بہت مشکل تھا اور میں اس شہر میں رہ کر اپنے علم میں کوئی امتیاز پیدا نہیں کرسکتا تھا' اس لیے میں نے واسط کو چھوڑ دیا''۔فرماتے ہیں:

ما عرفتُ حتی خرجتُ من واسط (٤)

''میں اُس وقت تک معرفت حاصل نہ کرسکا جب تک واسط سے باہر نہیں آیا''۔

اساتذہ

امام یزید بن ہارونؒ کے اساتذہ وشیوخ کی فہرست طویل ہے۔مشہور اساتذہ یہ ہیں: امام یحییٰ بن سعید' امام شعبہ بن حجاج' امام سفیان ثوری' امام سلیمان تیمی' امام حماد بن زید' امام حماد بن سلمہ اور امام عبدالعزیز الماجشون رحمۃ اللہ علیہم۔(٥)

تلامذہ

امام یزید بن ہارونؒ کے دبستانِ علم سے جن اساطینِ دہر نے استفادے کی سعادت حاصل کی ان میں امام احمد بن حنبل' امام اسحاق بن راہویہ' امام علی بن مدینی' امام یحییٰ بن معین اور امام آدم بن ابی ایاس رحمۃ اللہ علیہم کے نام قابل ذکر ہیں۔(٦)

درس وتدریس

تعلیم سے فراغت کے بعد امام یزید بن ہارون نے واسط میں مسندِ درس بچھائی' اور ان سے بے شمار طلبہ مستفید ہوئے۔واسط کے علاوہ کبھی کبھی بغداد جا کر تشنگانِ علم کو سیراب کرتے تھے۔علامہ خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

قدم یزید بغداد حدث بها ثم عاد الی واسط (٧)

''امام یزید بغداد آئے' وہاں درس حدیث دینے کے بعد واسط چلے گئے۔''

ان کے درس میں طلبہ کی تعداد ایک وقت میں ستر ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔

علمی تبحر

حدیث کے علاوہ ان کو فقہ پر بھی عبورِ کامل تھا۔علمائے اسلام نے حدیث اور فقہ میں

ان کے تبحر علمی کا اعتراف کیا ہے۔ خطیب نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ:

''یزید بن ہارون فقیہہ بھی تھے''۔(۸)

عزت و وقار

امام یزید بن ہارون اپنے علم و فضل کی وجہ سے بہت زیادہ معروف تھے۔ خلیفہ مامون الرشید اُن کے علم و فضل کا بہت زیادہ معترف تھا' اور ان کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

مامون الرشید کا رجحان نظریۂ خلقِ قرآن کی طرف تھا' لیکن اس کے باوجود امام یزید بن ہارون کی حق گوئی کا یہ عالم تھا کہ بغیر کسی خوف کے برملا اعلان کرتے تھے کہ: ''قسم ہے اُس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں' جو شخص خلقِ قرآن کا قائل ہے وہ کافر ہے''۔(۹)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا آپ مجسم نمونہ تھے۔ اسی لیے مامون الرشید جیسا باجبروت خلیفہ بھی ان سے مرعوب رہتا تھا۔ ارباب سِیَر نے لکھا ہے کہ: ''یزید بن ہارون کا شمار اُن ائمۂ اسلام میں ہوتا ہے جنہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا''۔(۱۰)

قوتِ حافظہ

اللہ تعالیٰ نے انہیں حافظہ کی غیر معمولی نعمت سے سرفراز کیا تھا۔ ان کے شاگرد امام علی ابن مدینی فرماتے ہیں:

ما رأیتُ احدا لحفظ من الصغار والکبار من یزید بن ہارون(۱۱)

''میں نے صغار و کبار میں یزید بن ہارون سے زیادہ قوتِ حفظ رکھنے والا نہیں دیکھا''۔

وفات

۲۰۶ھ میں ۸۸ برس کی عمر میں انتقال کیا۔(۱۲)

حواشی

(۱) تاریخ بغداد' ج ۱۴' ص ۳۴۰۔
(۲) تہذیب التہذیب' ج ۱' ص ۳۶۹۔
(۳) تاریخ بغداد' ج ۱۴' ص ۳۳۱۔
(۴) تذکرۃ الحفاظ' ج ۱' ص ۲۹۔
(۵'۶) ایضاً۔
(۷) تاریخ بغداد' ج ۱۴' ص ۳۳۷۔
(۸) ایضاً' ص ۳۴۰۔
(۹'۱۰) ایضاً' ص ۳۴۲۔
(۱۱) ایضاً۔
(۱۲) شذرات الذہب' ج ۲' ص ۱۶۔

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (38)

تُرکی (6)

(TURKEY)

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

دورِ استبداد کا آغاز

سلطان عبدالحمید ثانی نے پارلیمنٹ کو برخاست کرنے کے بعد پورے تیس سال ایک مطلق العنان بادشاہ اور ایک آمر مطلق کی حیثیت سے حکومت کی۔ اس میں شک نہیں کہ اس مدت میں بیرونی سازشوں اور کوششوں کے باوجود سلطنت عثمانیہ کی ایک چپہ زمین بھی انہوں نے ہاتھ سے نہیں نکلنے دی۔ جرمنی کی مدد سے فوجی نظام کو جدید ترین طریقے پر منظّم کیا اور جب مغربی طاقتوں کی شہ پر 1897ء میں یونان نے عثمانی علاقے پر حملہ کیا تو ترک فوجوں نے یونانیوں کو شکست فاش دے کر فوجی قوت کی دھاک بٹھادی۔ ترکی میں ریلوے کی پٹڑیاں بچھائی گئیں اور دمشق اور بغداد تک ریلوے لائن کی توسیع کی گئی۔ حجاز ریلوے کی تعمیر بھی اسی دَور میں شروع ہوئی۔ مدینہ تک تار برقی کا سلسلہ شروع ہوا۔ قانون، تجارت، انجینئرنگ اور زراعت کے کالج تعمیر ہوئے۔ استنبول یونیورسٹی میں شعبۂ طب قائم ہوا۔ فنونِ لطیفہ کی اکادمی قائم ہوئی۔ مطبوعات پر سخت احتساب کے باوجود صرف ابتدائی پندرہ برسوں میں ترکی میں چار ہزار کتابیں شائع ہوئیں۔

سلطان عبدالحمید نے اتحادِ اسلامی کی تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی اور غیر ترک مسلمانوں کو اعلیٰ عہدے دے کر ان میں سلطنتِ عثمانیہ کے ایک ترک ریاست سے زیادہ ایک اسلامی ریاست ہونے کا احساس پیدا کیا اور غیر ترک مسلمانوں میں اعتماد کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے فلسطین کو یہودی وطن بنانے کی کوششوں کو ناکام بنایا۔ ترکی بیرونی قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا، اور انگریزوں نے دو مرتبہ سلطان کو یہ قرض ادا کرنے کی پیشکش کی، بشرطیکہ وہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دے دیں، لیکن سلطان نے اس پیشکش کو سختی سے مسترد کر دیا۔

سلطان کے عہد کے یہ تمام کارنامے یقیناً قابل قدر ہیں' لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ترک قوم پرستوں میں سلطان عبدالحمید ایک انتہائی ناپسندیدہ شخصیت رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو نظریاتی اختلاف تھا۔ سلطان عبدالحمید خلافتِ عثمانیہ کو ترکوں اور عربوں کے تعاون سے ایک مسلم مملکت کی شکل دینا چاہتے تھے' جبکہ نوجوان ترکوں میں ترک قوم پرستی کے جذبات روز بروز زیادہ شدید ہوتے جا رہے تھے' لیکن سلطان سے نفرت کی سب سے بڑی وجہ اُن کا استبدادی طرزِ حکومت تھا۔ سلطان نے 1878ء میں دستور معطل کر کے اس جمہوری عمل کو روک دیا تھا' جس کا آغاز 1839ء میں ہوا تھا اور جس نے ترکوں کے تعلیم یافتہ اور دانشور طبقے میں جڑیں مضبوط کر لی تھیں۔ جدید مغربی تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ آئینی اور دستوری حکومت کے لیے ہمدردیاں بڑھتی چلی گئیں۔ جو طلبہ اعلیٰ اور خصوصی تعلیم کے لیے یورپ بھیجے جاتے تھے' وہ یورپ کی جمہوری فضا سے متاثر ہو کر آتے تھے' حتیٰ کہ ترک فوج میں بھی دستور سے ہمدردی رکھنے والوں نے زور پکڑ لیا۔ سلطان نے اپنے سیاسی مخالفوں کو کچلنے کے لیے طرح طرح کی سختیاں کیں۔ ان کو ہزاروں کی تعداد میں قید و بند میں ڈالا۔ لیبیا اور یمن جیسے دُور دراز ملکوں میں جلاوطن کیا۔ زبردست جاسوسی نظام قائم کیا' اور اخبارات' رسائل اور کتب پر کڑی نگرانی قائم کی' لیکن جبر و استبداد کے خلاف تحریک زور پکڑتی گئی۔

انجمن اتحاد و ترقی

چونکہ اب سلطنت عثمانیہ کی حدود میں سرگرمیاں ممکن نہیں تھیں' اس لیے نوجوان ترکوں نے مئی 1889ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا میں ''انجمن اتحاد و ترقی'' کے نام سے ایک انجمن قائم کی اور اس نے 1876ء کے دستور کی بحالی کے لیے مہم شروع کر دی۔ فوج میں انجمن کا اثر اتنا بڑھ گیا تھا کہ جولائی 1908ء میں مقدونیہ میں مقیم فوجی دستوں نے انور پاشا اور نیازی بے کی قیادت میں بغاوت کر دی اور 1876ء کے دستور کی بحالی کا مطالبہ کیا۔ سلطان عبدالحمید نے قوم پرستوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور 24 جولائی 1908ء کو مطالبہ مانتے ہوئے دستور بحال کر دیا۔ اس طرح تیس سالہ دورِ استبداد ختم ہوا اور ترکی میں دوسری مشروطیت کا آغاز ہوا جو 1918ء میں پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست تک قائم رہی۔ 14/اپریل 1909ء کو وہ مشہور حادثہ پیش آیا جسے ترکی کی تاریخ میں 31/مارچ کا حادثہ کہا جاتا ہے۔ اُس دن دارالحکومت استنبول کے ایک گروہ نے شہر کے فوجی دستوں کو ملا کر نئی مشروطی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور شریعت کی حکمرانی کا مطالبہ کیا۔ محمود شوکت پاشا نے اس بغاوت کو جلد ہی فرو کر دیا۔ سلطان عبدالحمید کو بغاوت کرانے کے الزام میں 27 اپریل کو معزول کر دیا گیا اور اُن کی جگہ ان کے ایک بھائی رشاد (1909ء تا 1918ء) کو خلیفہ مقرر کیا گیا۔

دوسری مشروطیت سے جمہوریت تک

آئینی حکومت بحال ہونے کے بعد ترکی میں سیاسی آزادی دے دی گئی' جس کے نتیجے میں کئی

سیاسی جماعتیں قائم ہوئیں۔ پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے اور اس میں سلطنت عثمانیہ کی تمام رعایا کو بلالحاظِ مذہب وملت آبادی کے تناسب سے نمائندگی ملی' لیکن یورپی ممالک میں آباد مسیحی باشندے سلطنت عثمانیہ سے مخلص نہیں تھے۔ وہ جمہوری اداروں کو اپنی مستقل آزادی کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ روس ان مسیحی عناصر کو شہ دے رہا تھا اور استنبول اور باسفورس پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ مغربی ملکوں نے نوجوان ترکوں کو اطمینان سے کام نہیں کرنے دیا۔ 1911ء میں اٹلی نے طرابلس (لیبیا) پر حملہ کر دیا اور ایک سال کے اندر اندر پورے علاقے پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد جنگ بلقان (1912ء تا 1913ء) چھڑ گئی' جس میں یونان' بلغاریہ اور سرویا نے ترکوں کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا اور مغربی ملکوں نے ان کی پشت پناہی کی۔ اس جنگ کے نتیجے میں استنبول سے ادرنہ تک کے علاقے کو چھوڑ کر سلطنت عثمانیہ کے تمام یورپی مقبوضات ہاتھ سے نکل گئے' جن کا رقبہ 55 ہزار مربع میل تھا اور آبادی 42 لاکھ تھی۔

پہلی جنگ عظیم

جنگ بلقان ختم ہوئی تو 1914ء میں جنگ عظیم (1914ء تا 1918ء) چھڑ گئی' جس میں عثمانی ترک جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ اس جنگ میں ترکوں نے اتحادی طاقتوں کا' جو روس' برطانیہ اور فرانس پر مشتمل تھیں' چار سال تک بڑی کامیابی سے مقابلہ کیا اور درۂ دانیال' قفقاز اور عراق کے محاذوں پر دشمن کو کئی بار شکستیں دیں' لیکن جرمنی کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد ترکوں کو بھی ہتھیار ڈالنے پڑے۔ 30/اکتوبر 1918ء کو جنگ بند ہو گئی۔ انور پاشا' طلعت پاشا اور جمال پاشا جو ترکوں کو جنگ میں شامل کرنے کے ذمہ دار تھے' اتحادیوں کی نئی ذلت آمیز شرائط کو قبول نہیں کر سکتے تھے اور مزید مزاحمت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے' اس لیے وہ ترکی سے باہر چلے گئے۔ انور پاشا ترکستان کی آزادی کی جدوجہد کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ طلعت پاشا برلن میں اور جمال پاشا طفلس میں آرمینیا کے باشندوں کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ 12/جنوری 1920ء کو عثمانی پارلیمنٹ کا آخری اجلاس ہوا اور 16 مارچ 1920ء کو اتحادی فوجیں استنبول میں داخل ہو گئیں۔ ساڑھے چار سو سال کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ سلطنتِ عثمانیہ کے دارالحکومت پر غیروں کا قبضہ ہوا ہو۔ اس واقعہ نے نہ صرف ترکی بلکہ ساری اسلامی دنیا کو غم و غصے میں مبتلا کر دیا۔ خلیفۂ اسلام اب انگریزوں کے رحم و کرم پر تھا۔ اتحادی طاقتیں ترکی کے حصے بخرے کر دینا چاہتی تھیں' لیکن اس دوران میں اناطولیہ میں مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں آزادی کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ 1922ء کے اواخر تک ترکوں نے تمام دشمنوں کو اناطولیہ سے نکال باہر کیا۔ سلطان وحیدالدین' جس کو انگریزوں نے اپنے تسلط کے دَور میں بادشاہ مقرر کیا تھا' 17/اکتوبر 1922ء کو ایک برطانوی جہاز میں فرار ہو گیا۔ قوم پرست ترکوں نے اس کی جگہ سلطان عبدالحمید کو خلیفہ منتخب کیا' لیکن 29/اکتوبر 1923ء کو بادشاہت ختم کر کے ترکی کو جمہوریہ قرار دیا گیا اور 3/مارچ 1924ء کو

E:\Meesaaq_2006\Ms_2006\meesaq december06\ms-turki-6.inp 8/20/2014 1:21 PM PAGE 2 (1,1)

خلافت بھی ختم کر دی گئی۔ اس طرح سلطنت وخلافت عثمانیہ کا 625 سال بعد خاتمہ ہو گیا۔ اسلامی تاریخ میں کسی مسلمان خاندان نے اتنے طویل عرصے تک حکومت نہیں کی۔

انور پاشا

وہ ترک رہنما جن کی کوششوں سے 1877ء میں پہلی مشروطیت قائم ہوئی ’’نوجوان عثمانی‘‘ کہلاتے ہیں اور وہ رہنما جو دوسری مشروطیت کا باعث ہوئے ’’نوجوان ترک‘‘ کہلاتے ہیں۔ مشروطیت کے اس دور میں محمود شوکت پاشا (1856ء تا 1913ء) اور انور پاشا (1881ء تا 1922ء) سب سے بااثر شخصیت تھے۔ 1913ء میں محمود شوکت پاشا کی شہادت کے بعد اگرچہ سعید حلیم پاشا وزیراعظم منتخب ہوئے‘ لیکن 1913ء سے 1918ء تک حقیقی اقتدار ارکانِ ثلاثہ کے ہاتھ میں تھا جو انور پاشا‘ طلعت پاشا اور جمال پاشا پر مشتمل تھے اور جس میں سب سے اہم شخصیت انور پاشا کی تھی۔ انور پاشا نے جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں مجاہدانہ کارنامے انجام دیے تھے جس کی وجہ سے وہ عالمِ اسلام کی مقبول ترین شخصیت بن گئے تھے۔ اس کے علاوہ انور پاشا نے سلطان عبدالحمید کی استبدادی حکومت کو ختم کر کے دستوری حکومت کے قیام میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ جنگ عظیم کے دوران میں وہ وزیر جنگ تھے‘ بلکہ ایک طرح سے پوری سلطنت کے مختارِ کُل تھے۔ اُن کے عہد میں ترکی کی فوجوں کی جرمن ماہرین عسکریات کی نگرانی میں نئی تنظیم کی گئی اور یہ تنظیم نو ہی کا نتیجہ تھا کہ ترکی جیسے چھوٹے اور زوال پذیر ملک نے‘ جو یورپ کا ’’مردِ بیمار‘‘ کہلاتا تھا‘ روس‘ برطانیہ اور دوسرے اتحادی ملکوں کا چار سال تک مقابلہ کیا۔ انور پاشا پاکیزہ سیرت کے مالک تھے اور ذہنی و عملی دونوں حیثیت سے سچے مسلمان تھے‘ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود انور پاشا مفکر اور مصلح نہیں تھے‘ بلکہ ایک جذباتی انسان تھے۔ ایک پُرجوش مجاہد تھے۔ اُن کی شخصیت بڑی دلکش تھی۔

عربوں کی بغاوت

’’انجمن اتحاد و ترقی‘‘ ‘ جس کے انور پاشا قائد تھے‘ کوئی نظریاتی جماعت نہیں تھی۔ وہ ترک اور غیر ترک‘ اسلام پسند اور اسلام دشمن‘ کٹر اور معتدل وطن پرستوں اور اتحاد توران اور اتحادِ اسلام کے حامیوں پر مشتمل مختلف عناصر کا مجموعہ تھی۔ اسی وجہ سے یہ انجمن نظریاتی انقلاب نہیں لاسکی۔ اس کا مقصد صرف عبدالحمید خان ثانی کی استبدادی حکومت کو ختم کر کے دستوری نظام قائم کرنا تھا‘ اور جب یہ مقصد حاصل ہو گیا تو انجمن میں انتشار پڑ گیا۔

’’نوجوان ترک‘‘ اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہے۔ ان کے برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد 1908ء میں بلغاریہ آزاد ہو گیا اور 1913ء تک یورپ کے تمام علاقے ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اب سلطنت عثمانیہ صرف ترک اور عرب علاقوں پر مشتمل رہ گئی۔ 1914ء میں سلطنت کی آبادی میں سوا کروڑ ترک اور 53 لاکھ عرب تھے اور عثمانی پارلیمنٹ کے 259 ارکان کے ایوان میں 144 ترک اور

84 عرب تھے۔ گویا عربوں کی نمائندگی ان کے تناسب سے زیادہ تھی۔ اس کے باوجود عربوں کو مطمئن نہیں کیا جا سکا۔ وہ عرب قوم پرستی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ یورپی اقوام کی طرح وہ بھی اپنی آزاد عرب ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ چند عرب رہنماؤں مثلاً شریف سنوسی، رشید رضا مصری اور امیر شکیب ارسلان وغیرہ نے عربوں اور ترکوں کے اتحاد کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کی، لیکن ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ عربوں نے حجاز، شام اور عراق میں جنگ عظیم کے دوران انگریزوں کی سازش کا شکار ہو کر ترکوں کے خلاف 1916ء میں بغاوت کر دی اور اس طرح عرب علاقے سلطنت عثمانیہ سے آزاد ہو گئے۔

اس ساری کشمکش میں قصور صرف عربوں کا نہیں تھا، ترک بھی اس میں برابر کے شریک تھے۔ عربوں کی طرح ان میں بھی ایک طبقہ ترک قوم پرستی کا شکار ہو چکا تھا۔ وہ کبھی اتحاد تورانؔ، کبھی عثمانی قومیت اور کبھی ترک قومیت کے نعرے لگاتا تھا اور سلطنتِ عثمانیہ میں ترکوں کی برتری کو ہر شکل میں قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ترکوں میں سعید حلیم پاشا، محمد عاکف اور اشرف ادیب جیسی اسلام پسند شخصیات و عوامل موجود تھے، جو اعتدال و توازن کی راہ اختیار کرنا چاہتے تھے، لیکن اُن کے پاس کوئی واضح نظریاتی پروگرام نہیں تھا، جس کی وجہ سے اُن کی آواز بھی صدا بہ صحرا ثابت ہوئی اور آخر میں فتح ترک قومیت اور عرب قومیت کی ہوئی اور اسلام کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔

ترکوں کا قومی کردار

سلطنت عثمانیہ چھ سو سال سے زیادہ قائم رہی۔ اسلامی تاریخ میں کسی ایک خاندان نے اتنے طویل عرصہ متواتر حکومت نہیں کی اور نہ کسی قوم کو اتنا عروج حاصل ہوا جتنا عثمانی ترکوں کو۔ عثمانی ترکوں میں حکومت اور نظم و نسق کی حیرت انگیز صلاحیت تھی۔ چار سو سال تک اُن کا عروج قائم رہا، اور اس کے بعد جب زوال ہوا تو ان کی سلطنت امویوں، عباسیوں اور مغلوں کی طرح ایک دم ختم نہیں ہوئی، بلکہ دو سو سال کا عرصہ لگ گیا۔ دشمنوں کو انہوں نے اپنے علاقے آسانی سے نہیں دیئے، بلکہ ایک ایک قدم کے لیے جنگ کرتے رہے اور بارہا انہوں نے اپنے بگڑے ہوئے حالات کو سنبھال لیا۔ عثمانی ترکوں کی یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی مثال تاریخ اسلام میں دوسری جگہ نہیں ملتی۔

عثمانی سلطنت کی مضبوطی اور استحکام کے کئی اسباب تھے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ ان کی حکومت زیادہ قانونی انداز کی تھی۔ بادشاہ کے مشورے کے لیے ''بابِ عالی'' کے نام سے ایک ادارہ تھا جس میں ایک خاص صلاحیت کے لوگ لیے جاتے تھے۔ اس مشاورتی ادارے کی وجہ سے سلطنت کا کام زیادہ خوبی سے انجام دیا جاتا تھا اور بادشاہ زیادہ من مانی نہیں کر سکتا تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ عثمانی سلاطین کے پاس ''ینی چری'' کے نام سے ایک باقاعدہ اور منظم فوج تھی۔ یہ دنیا کی پہلی مستقل اور باقاعدہ فوج تھی۔ اس فوج کو سخت قسم کی تربیت دی جاتی تھی اور وہ اپنے

زمانے کے جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دشمن اس فوج کا صدیوں تک مقابلہ نہیں کر سکے۔

لیکن سب سے بڑی وجہ ترکوں کا اخلاق اور اعلیٰ کردار ہے۔ ترک ہمیشہ سادگی پسند، جفاکش اور جانباز رہے ہیں۔ عیش وعشرت کی زندگی سے، جو انسان کو آرام طلب بناتی اور خودغرضی سکھاتی ہے، وہ زیادہ سے زیادہ دُور رہے۔ اسی طرح وہ بددیانتی، شراب، جوا اور بے حیائی کے کاموں سے بھی دوسری مسلم قوموں کے مقابلے میں زیادہ بچے رہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے اخلاق و کردار میں عرصۂ دراز تک خرابیاں پیدا نہ ہوسکیں۔ ترکوں کی ان خوبیوں کا تمام مؤرخوں نے، جن میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں، دل کھول کر اعتراف کیا ہے۔

تنظیمات کا دَور اور نظریاتی کشمکش

ترکی میں جدید دَور کا آغاز تنظیمات کی اصلاحات سے ہوتا ہے۔ ان اصلاحات نے بلاشبہ مادّی میدان میں ترکوں کو بہت فائدہ پہنچایا۔ وہ پہلی مرتبہ جدید افکار ونظریات، جدید سائنس اور جدید علوم سے واقف ہوئے اور مسلمانوں کا فکری جمود، جس میں وہ سقوطِ بغداد کے بعد سے مبتلا تھے، ٹوٹ گیا۔ لیکن اس دور میں ایک بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے نظامِ تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، یعنی دینی تعلیم اور دنیوی تعلیم۔ ایسا کرنا یورپ میں تو صحیح تھا، کیونکہ مسیحیت دنیوی اُمور میں لوگوں کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتی تھی، لیکن مسلمانوں کے لیے دین اور دنیا یا مذہب وسیاست کی یہ دُوئی صحیح نہیں تھی۔ اسلام مسلمانوں کی شروع ہی سے زندگی کے تمام معاملات میں رہنمائی کرتا چلا آ رہا تھا اور اس کا نتیجہ معاشرے اور ریاست کے لیے ہمیشہ مفید ثابت ہوا۔ تنظیمات کے عہد میں جب تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تو جدید تعلیم یافتہ طبقہ، جس نے دُنیوی مدرسوں میں تعلیم پائی تھی، اسلام کی رہنمائی سے محروم ہو گیا اور دینی مدارس میں تعلیم پانے والا طبقہ صرف مسجد کا مُلّا بن کر رہ گیا۔ اس نظامِ تعلیم نے علماء کے طبقے کو قدامت پسندی میں سخت کر دیا اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کو اسلام کی طرف سے بے نیاز و بے حس کر دیا۔

عہدِ تنظیمات کے رہنماؤں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے اسلامی تعلیمات اور مغربی تصورات میں توازن قائم رکھا اور بقول خالدہ ادیب خانم، ان کے رگ و پے میں اسلامیت بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے دل و دماغ دونوں مسلمان تھے۔ ان میں اپنی کمزوری کا احساس ضرور تھا، مگر مغرب کے مقابلے میں وہ احساسِ کمتری میں ہرگز مبتلا نہ تھے۔ وہ مغرب سے مرعوب نہ تھے۔ اُن کا مقصد صرف یہ تھا کہ مغرب کی مفید چیزوں کو لے کر اپنی سلطنت کی اور اپنی کمزوریوں کو دور کریں، لیکن عہدِ تنظیمات کے دُنیوی مدرسوں میں اور یورپ کے مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جو نئی نسل تیار ہوئی، وہ ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو عہدِ تنظیمات کے اصلاح پسندوں سے بالکل مختلف تھے۔ ان میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو علمی قابلیت، تدبر و تفکر اور عالی دماغی میں عہدِ تنظیمات کے مدبرین کی ٹکر کا ہو۔ یہ چند ایسے نوجوانوں کا

اجتماع تھا جو اسلامی علوم و الٰہیات میں کورے تھے۔ اسلامی تربیت و تہذیب میں ناقص تھے۔ مغربی علوم میں بھی گہری نظر نہ رکھتے تھے۔ اپنے مذہب، اپنی تہذیب، اپنے علوم و فنون، آداب و اطوار اور اپنی قدیم اجتماعی تنظیمات کے خلاف اُن کے دل و دماغ میں تعصب کا گہرا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ مغرب سے مرعوبیت اُن میں بدرجۂ اتم پیدا ہو چکی تھی۔

یہ وہ نسل تھی جو سلطان عبدالحمید خان کا تختہ الٹ کر برسر اقتدار آئی تھی۔ سلطان عبدالحمید نے اپنے دَور میں رجعت پسند علماء اور مشائخ کی مدد سے عہد تنظیمات کے مصلحین کی اٹھائی ہوئی بنیادیں مسمار کرنے اور ترکی قوم کے ادبی و ذہنی ارتقاء کو روکنے اور سیاسی و تنظیمی اصلاحات کا استیصال کرنے کی جو کوششیں کیں، اُن کی وجہ سے یہ نئی نسل مانع ترقی سمجھنے لگی۔

انیسویں صدی میں ترکوں کی جدید تعلیم یافتہ نسل کو جن مغربی افکار و تصورات نے متاثر کیا، اُن میں ایک وطن پرستی اور قومیت کا سیاسی تصور بھی تھا۔ شروع میں یہ تصور حبّ الوطنی تک محدود رہا، لیکن بعد میں اس تصور نے ترکوں میں نسلی اور قومی برتری کا احساس پیدا کر دیا اور جب اس کا عرب قوم پرستی کے تصور سے ٹکراؤ ہوا تو سلطنت عثمانیہ پارہ پارہ ہوگئی۔ قوم پرستی، وطن پرستی اور سیکولرازم کے رجحان کو ترکوں میں فروغ دینے میں مغربی مفکرین اور فلسفیوں کے علاوہ فری میسن تحریک کا بھی نمایاں ہاتھ ہے، جس نے انیسویں صدی کے وسط میں استنبول اور سالونیکا میں اپنے لاج بنا لیے تھے۔ عہد تنظیمات اور دوسری مشروطیت کے بیشتر رہنما فری میسن تحریک کے عزائم سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اُن کے جال میں پھنس گئے تھے اور اس تحریک کی رکنیت اختیار کر لی تھی۔ سلطان عبدالحمید خان کو معزول کرنے کے لیے ''انجمن اتحاد و ترقی'' کے ارکان پر مشتمل جو جماعت مقرر کی گئی تھی، اُن میں سالونیکا کے فری میسن لاج کا یہودی ماسٹر قرہ صو بھی شامل تھا۔ (جاری ہے)